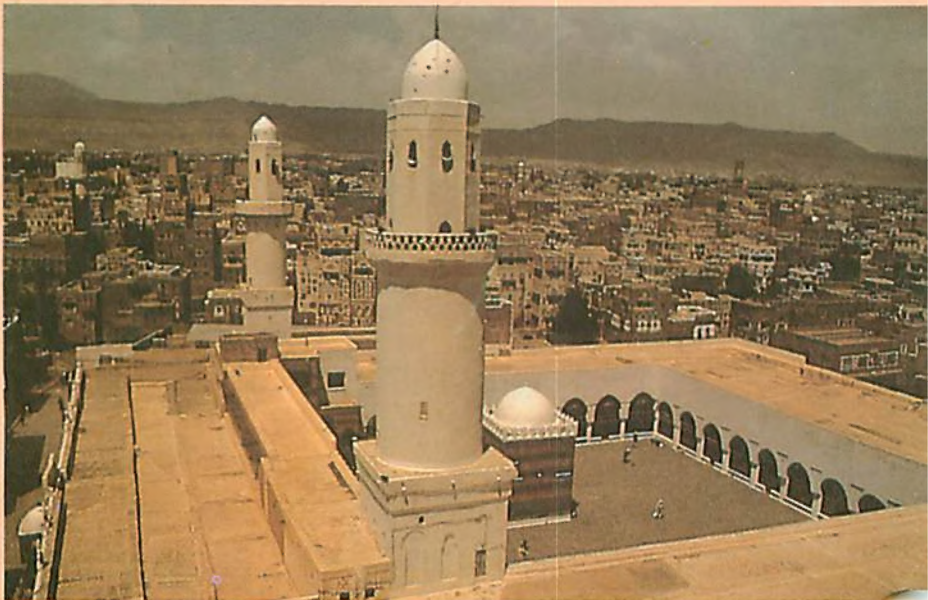
یکساں سول کوڈ صفحہ ۱۱

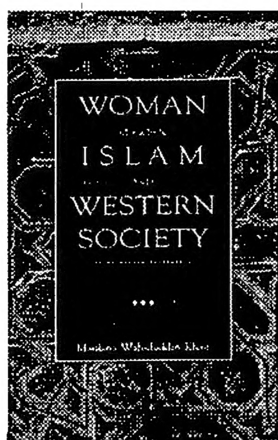
الرسالہ
Al-Risala

September 1995 • Issue 226 • Rs. 7

عقل کی طاقت سازش کی طاقت سے زیادہ ہے
عقل کی طاقت کے ذریعہ
آپ دشمن کی ہر سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔



The Great Mosque of Sana'a, Yemen



WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

By Maulana Wahiduddin Khan

The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

Pages: 256. Price Rs. 95
ISBN 81-85063-75-3

AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4697333 Fax: 91-11-4697333

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

ستمبر ۱۹۹۵ ، شمارہ ۲۲۶

ضروری اعلان

اس شمارہ میں "یکساں سول کوڈ" کے موضوع پر ایک جامع مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔ موضوع کی اہمیت کی بنا پر اس کو الگ کتابچہ کی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ اس کتابچہ کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلایا جائے۔ اس کتابچہ کی قیمت پانچ روپے ہوگی۔ لیکن جو حضرات اسے مفت تقسیم کروانا چاہیں گے ان کے لیے رعایتی قیمت تین روپے ہوگی۔ کم از کم ۱۰۰ کی تعداد لینے پر ڈاک خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا۔

منیجر الرسالہ

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

اعتماد و توکل

قرآن (آل عمران ۱۵۹) میں ہے کہ جب تم معاملہ کا فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو (فاذا عزمت فتوکل علی اللہ) گویا عمل کا پختہ ارادہ انسان کو کرنا ہے اور نتیجہ کے معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دینا ہے۔

الترمذی کی روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر تم اللہ پر اس طرح بھروسہ کرو جس طرح بھروسہ کرنے کا حق ہے تو ضرور وہ تم کو اسی طرح روزی دے گا جس طرح وہ چڑیا کو روزی دیتا ہے۔ چڑیا صبح کو خالی پیٹ نکلتی ہے اور شام کو بھرے پیٹ کے ساتھ واپس آتی ہے (لو انکم تتوکلون علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر۔ تغدو خماصا وتروح بطاناً)

چڑیا اپنے بسیرے کے مقام سے نکل کر روزی کی تلاش میں جاتی ہے۔ یہ نکلنا اس کا اپنا فعل ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو رزق اسے ملتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ رزق کی تلاش چڑیا کا کام ہے اور تلاش کے نتیجہ کا تعلق خدا سے۔

الترمذی (کتاب القیامۃ) میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، میں اپنے اونٹ کو باندھوں اور پھر توکل کروں یا اس کو چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں، آپ نے فرمایا تم اپنے اونٹ کو باندھو اور پھر توکل کرو (یا رسول اللہ اعقلها و اتوکل او اطلقها و اتوکل. قال اعقلها و توکل) گویا اپنے جانور کو باندھنے کا کام خود آدمی کو انجام دینا ہے۔ باندھنے کے بعد جانور ٹھہرے گا یا رسی توڑ کر بھاگ جائے گا، اس معاملہ میں خدا کی کارسازی پر اعتماد کرنا ہے۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ کوشش میری طرف سے اور اس کی تکمیل اللہ کی طرف سے (السعی منی و الاتمام من اللہ)

ہر کام میں ایک چیز ہوتی ہے محنت، اور دوسری چیز ہے نتیجۂ محنت۔ توکل کا تعلق محنت سے نہیں ہے بلکہ نتیجۂ محنت سے ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ جب وہ کوئی کام کرنے کے لئے اٹھے تو پورے عزم کے ساتھ اس کو انجام دے۔ وہ اپنی پوری طاقت اس میں لگا دے۔ مگر نتیجہ کے معاملہ کو وہ اللہ کے اوپر چھوڑ دے۔ آدمی اگر محنت کو خدا پر چھوڑے گا تو اس سے کاہلی اور بے عملی پیدا ہوگی۔ اور اگر وہ نتیجہ میں توکل کا طریقہ اختیار نہ کرے گا تو وہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

تنگی میں آسانی

فتح مکہ کا واقعہ ۸ھ میں پیش آیا۔ اس کے بعد آپ نے صحابہ کرام کے ساتھ مکہ سے طائف کا سفر فرمایا۔ اس سفر میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا:

قال ابن اسحاق: ثم سلك فى طريق يقال لها الضيقة. فلما توجه رسول الله صلى الله عليه وسلم سأل عن اسمها، فقال ما اسم هٰذه الطريق. فقيل الضيقه. فقال: بل هى اليسرى (البدايه والنهايه لابن كثير ۴/۳۴۶)

پھر آپ ایک راستہ میں چلے جس کو تنگ راستہ کہا جاتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ نے اس کا نام پوچھا۔ کہا گیا کہ اس کا نام تنگ راستہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ آسان راستہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ وہ تنگ ہے مگر بند تو نہیں۔ بظاہر اگرچہ یہ راستہ تنگ دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن اگر ہمت اور احتیاط سے کام لیں تو یقیناً ہم اس سے گزر سکتے ہیں۔ پھر تنگی کے باوجود اگر وہ ہمارے لیے رکاوٹ نہیں تو ہم اس کو تنگ کیوں کہیں۔ کیوں نہ ہم اس کو آسان کہیں۔ کیوں کہ اصل مقصد گزرنا ہے اور وہ اب بھی ہمیں حاصل ہے۔

یہ واقعہ اس طرح کے معاملات میں مومن کے مزاج کو بتاتا ہے۔ مومن چیزوں کو ان کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں دیکھتا بلکہ چیزوں کو ان کے باطن کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ مومن معاملات کے تاریک پہلو کو نظر انداز کر دیتا ہے اور صرف اس کے روشن پہلو پر اپنی تمام توجہ لگا دیتا ہے۔ مومن کیا ہے کو نہیں دیکھتا، وہ ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ کیا ہو سکتا ہے۔ مومن ناموافق پہلو کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ صرف موافق پہلو پر اپنی ساری نظریں جما دیتا ہے۔

مومن منفی سوچ سے مکمل طور پر پاک ہوتا ہے۔ اس کی سوچ تمام تر مثبت سوچ ہوتی ہے۔ مومن کی شخصیت کو بتانے کے لئے اگر نفسیاتی اصطلاح استعمال کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومن ایک مثبت مفکر (positive thinker) ہوتا ہے۔ یعنی مثبت ذہن رکھنے والا انسان۔

مومن کی یہ صفت اس کو بے پناہ بنا دیتی ہے۔ اس کے لئے رکاوٹیں بھی زینہ بن جاتی ہیں۔ تنگ راستہ بھی اس کے لئے کشادہ راستہ بن جاتا ہے۔

صبر ـــــ سپیر یر سولیوشن

قرآن کی تقریباً دو سو آیتیں براہ راست طور پر صبر سے متعلق ہیں۔ اور بقیہ آیتیں بالواسطہ طور پر صبر سے متعلق۔ گویا قرآن کی تمام تعلیمات صبر پر مبنی ہیں۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قرآن صبر کی کتاب ہے۔

صبر کی براہ راست آیتوں کا معاملہ واضح ہے۔ مثلاً و استعینوا بالصبر والصلاۃ (البقرہ ۴۵) واصبر علی ما اصابك (لقمان ۱۷) وتواصوا بالصبر (العصر ۳) ودع اذاھم (الاحزاب ۴۸) یہ آیتیں وہ ہیں جن میں براہ راست الفاظ میں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔

مگر دوسری بیشتر آیتوں کا بھی صبر سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً قرآن کی پہلی آیت ہے: الحمد للہ رب العٰلمین (الفاتحہ) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کے بندے اس کا شکر اور تعریف کریں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں کوئی بھی آدمی ناخوشگوار تجربات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قرآن کے مطابق انسان کو کبد (مشقت) میں پیدا کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں کسی کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں خوشیوں اور مسرتوں کی زندگی بنا سکے۔

پھر حقیقی معنوں میں کوئی آدمی شکر کرنے والا کیسے بن سکتا ہے۔ اس کا واحد راز صبر ہے۔ یعنی آدمی جب دنیا میں پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کرے گا، اسی وقت اس کے لئے ممکن ہوگا کہ سچا کلمۂ شکر اس کی زبان پر جاری ہو سکے۔ اسی لئے قرآن میں شکر کے ساتھ صبر کو وابستہ کیا گیا ہے (لقمان ۳۱)

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ مسائل کے مقابلہ میں تسخیری انداز کا برتر حل دریافت کر سکے۔ آدمی جب فریق ثانی کے مقابلہ میں بھڑک جائے تو وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ وہ سوچ کر کوئی گہرا جواب دے یا کوئی دور رس منصوبہ بنا سکے۔ مگر جب وہ صبر و تحمل سے کام لیتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ فوری اقدام کے بجائے سوچا سمجھا ہوا اقدام کرے۔ اور یہ تاریخ کا تجربہ ہے کہ فوری اقدام کرنے والا ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور سوچ سمجھ کر اقدام کرنے والا ہمیشہ کامیاب۔

صبر ہر قسم کے مسائل کا برتر حل (سپیر یر سولیوشن) ہے۔

دس اقوال

امریکہ میں چھپی ہوئی ایک کتاب نظر سے گزری۔ یہ کتاب ایک کامیاب امریکی تاجر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس نے یہ کتاب اپنے ۲۰ سالہ تجارتی تجربات کی روشنی میں تیار کی ہے۔ اس خوبصورت کتاب میں ہر صفحہ پر دو تجارتی اصول جلی حرفوں میں درج ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ٹاپ پر فارمرس نے ہمیشہ مثبت عادات (positive habits) کے ذریعہ ترقی کی ہے:

The Book of Excellence by Byrd Baggett.
236 habits of effective salespeople

ان مثبت عادتوں کو مصنف نے ۲۳۶ چھوٹے چھوٹے جملوں میں مرتب کیا ہے۔ کتاب کو پڑھ کر میں نے دس جملے منتخب کئے ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں:

A bad attitude cancels all other positive skills.
Be as critical of yourself as you are of others.
You are not learning anything when you are talking.
Excellence is not optional.
Take an active, not passive, role in helping your community.
Customers love humility.
Patience is a virtue: Don't give up.
There is no replacement for effort.
Success does not come easily. Are you willing to pay the price?
Stop, listen, and think before you respond.

یعنی ایک برا رویہ تمام دوسری خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اپنے بارہ میں بھی اتنا ہی تنقیدی بنو جتنا تم دوسروں کے لئے تنقیدی ہو۔ جب تم بولتے ہو تو تم کچھ سیکھ نہیں رہے ہو۔ امتیاز کوئی اختیاری چیز نہیں۔ اپنی کیمونٹی کی مدد کرنے میں فعال کردار ادا کرو۔ گاہک ہمیشہ تواضع کو پسند کرتے ہیں۔ برداشت ایک نیکی ہے، اس کو کبھی نہ چھوڑو۔ کوشش کا کوئی بدل نہیں۔ کامیابی آسانی سے نہیں آتی، کیا تم اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہو۔ ٹھہرو، سنو، اور جواب دینے سے پہلے غور کرو۔

یہ اقوال اس فطری حکمت کو بیان کرتے ہیں جن کو اختیار کرکے کوئی شخص دنیا میں اپنی کامیابی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ یہ اقوال کامیابی کی کنجی ہیں۔

حقیقت کی تلاش

لیوس کیرول (Lewis Carrol) ایک برٹش مصنف ہے۔ وہ ۱۸۳۲ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۹۸ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے بچوں کے لئے کچھ کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ اتنی دلچسپ ہیں کہ اس کی کہانیوں کی ایک کتاب کو پڑھ کر چھ سال کے ایک بچہ نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ اس کی ۶۰ ہزار جلدیں ہوں:

he wished there were 60,000 volumes of it. (3/967)

تاہم لیوس کیرول ایک غمگین آدمی تھا۔ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ تنہائی میں زندگی گزار کر مر گیا۔ اس نے کہا کہ ــــ میں اس دنیا میں کیا ہوں۔ اُف، یہ ایک عظیم معما ہے:

Who in the world am I? Ah, that's the great puzzle.

یہ اس دنیا میں ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ کوئی زیادہ شدت کے ساتھ اس کو محسوس کرتا ہے اور کوئی کم شدت کے ساتھ۔ تاہم کوئی بھی آدمی اس سوال سے خالی نہیں۔

عام جانوروں کا بنیادی مسئلہ صرف دو ہے، غذا اور تحفظ۔ جانور کو اگر یہ دو چیزیں مل جائیں تو اس کے بعد وہ نہایت سکون کے ساتھ سو جائے گا۔ مگر انسان کے اندر اسی کے ساتھ ایک اور چیز کی شدید طلب پائی جاتی ہے۔ اور وہ ہے زندگی کی حقیقت۔

فلسفہ اور سائنس جیسے علوم اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں دیتے۔ کیوں کہ فلسفہ اور سائنس کا علم تو خود انسان نے بنایا ہے۔ یعنی وہی انسان جو حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے وہی ان علوم کو مرتب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام علوم ناقص ہیں، اور ناقص علم سے کامل جواب حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

پیغمبرانہ الہام اسی سوال کا جواب ہے۔ جو آدمی اس کا مطالعہ کرے گا وہ اس میں اپنی طلب کا جواب پالے گا۔ پیغمبرانہ الہام خود اپنی ذات میں صداقت ہے۔ طالب کی بے آمیز فطرت کے سامنے جب یہ ربانی کلام آتا ہے تو خود اس کا اندرونی احساس یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ عین وہی چیز ہے جو اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ پیغمبر کا الہامی کلام طالب کے لئے اپنی دلیل آپ بن جاتا ہے۔

دلیل کی زبان میں

یکساں سول کوڈ کا مسئلہ ملک کے سامنے تقریباً ۰، سال سے ہے۔ اکثریتی فرقہ عام طور پر اس کا حامی رہا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ مخالفت مسلمانوں کی طرف سے سامنے آئی ہے۔ اس مدت میں ہمارے علماء اور دانشوروں نے ہزاروں کی تعداد میں اس کے خلاف مضامین اور بیانات شائع کیے ہیں۔ جلسوں اور تقریروں کی صورت میں اس مسئلہ پر جتنا زیادہ بولا گیا ہے شاید کسی اور ملی مسئلہ پر نہیں بولا گیا ہے۔

تاہم ان تمام کوششوں کا نتیجہ صفر ہے۔ ان مخالفتوں، نیز بعض دوسرے اسباب سے اگرچہ ایسا ہوا کہ یکساں سول کوڈ کی بنیاد پر ہندستانی پارلیمنٹ نے ابھی تک ایکٹ نہیں بنایا۔ تاہم ہماری ہالیائی مخالفتیں ایک اور نقصان کو ظہور میں آنے سے روک نہ سکیں۔ اور وہ اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان بڑھتی ہوئی نفرت ہے۔ اکثریتی فرقہ کا ذہن جب یہ ہو کہ یکساں سول کوڈ ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ تو ایسی حالت میں اس قسم کے کوڈ کا نہ بننا یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ اقلیتی فرقہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ اور اقلیتی فرقہ کے خلاف اکثریتی فرقہ کا یہ تاثر بلاشبہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے کم خطرناک نہیں۔

اس مسئلہ کا حل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ یکساں سول کوڈ کے نظریہ کو عین اسی بنیاد پر رد کیا جائے جو اکثریتی فرقہ کے نزدیک قابل لحاظ ہے۔ یعنی دلائل و حقائق کی بنیاد۔ جب ہم یہ کہیں کہ "یکساں سول کوڈ ہمارے مذہب میں مداخلت ہے" تو یہ زبان فریق ثانی کو صرف ایک ناپسندیدہ چیخ و پکار معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب ہم یہ ثابت کردیں کہ یکساں سول کوڈ خود قومی مصالح اور عقلی دلائل کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو یقیناً وہ ہماری بات پر غور کرے گا اور اس کو ماننے پر مجبور ہوگا۔

اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے ہر تقاضے کو دلائل فطرت کے زور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ پھر جب یکساں سول کوڈ کے معاملہ کو دلائل فطرت کے زور پر رد کرنا ممکن ہو تو کیا ضرورت ہے کہ ہم وہ زبان استعمال کریں جو فریق ثانی کو منفی شور و غل کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتی۔

اس طرح کے نزاعی معاملات میں یہی اسلام کا طریقہ ہے۔ الجاحظ (۲۵۵-۱۶۳ ھ) عربی ادب کا امام سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک مشہور کتاب البیان والتبیین ہے۔ اس کتاب میں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مختلف ادبی خصوصیات بیان کی ہیں۔ احادیث کے گہرے مطالعہ کے بعد اس نے آپ کی ایک صفت ان الفاظ میں بیان کی ہے :

كانَ لَا يُريدُ اسكاتَ الخَصمِ إلّا بما يَعرِفُه۔ — آپ کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے مخالف فریق کو آپ انھیں باتوں کے ذریعہ چپ کراتے تھے جن سے وہ واقف اور آشنا ہو۔

اسی بات کو الشاطبی نے اپنی کتاب الموافقات میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اختلافی بحث میں وہی دلیل معتبر ہے جو متنازع فیہ نہ ہو بلکہ فریق ثانی کے نزدیک تسلیم شدہ ہو۔ (الموافقات فی اصول الاحکام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۹۸)

اس اصول کی روشنی میں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ یکساں سول کوڈ کے معاملہ میں ہم اپنے نقطۂ نظر کو عقلی دلائل اور علمی حقائق کی روشنی میں بیان کریں۔ کیوں کہ یہی انداز اور یہی اسلوب فریق ثانی کے نزدیک قابل لحاظ ہے اور یہی وہ انداز استدلال ہے جس کو موجودہ زمانہ میں باوزن استدلال سمجھا جاتا ہے۔

زیر نظر مقالہ میں اسی خاص اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں مسلّمہ حقائق اور متفق علیہ معیار کی روشنی میں ملّت مسلمہ کے نقطۂ نظر کو مدلل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مقالہ لوگوں کو سنجیدہ غور وفکر پر مجبور کرے گا اور ان شاء اللہ وہ حالات پیدا ہوں گے جب کہ خوش اسلوبی کے ساتھ اس قدیم نزاع کا خاتمہ ہو جائے۔

اگلے ۴۲ صفحات میں جو مقالہ "یکساں سول کوڈ" کے عنوان سے شامل ہے، وہ وقت کے اسی اہم ترین موضوع پر دلائل وحقائق کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے۔ اس میں کامن سول کوڈ کو اینٹی مسلم بتانے کے بجائے اس کو اینٹی ریزن ثابت کیا گیا ہے۔ الرسالہ کے علاوہ اس کو علاحدہ پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کیا جا رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کو پھیلایا جا سکے۔ اس کے علاوہ ان شاء اللہ اس کو انگریزی اور ہندی زبان میں بھی شائع کیا جائے گا، یہاں تک کہ لوگ کہہ اٹھیں : کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا۔

یکساں سول کوڈ

دلائل وحقائق کی روشنی میں

مولانا وحید الدین خان

Al-Risala Book Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128 Fax: 91-11-4697333

یکساں سول کوڈ

یکساں سول کوڈ کا تصور آزادی (۱۹۴۷) کے پہلے سے ہندستان میں چلا آرہا ہے۔ مگر اب وہ زیادہ تر دستور ہند کا مسئلہ بن گیا ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بعد ملک کا جو دستور بنا اس میں یونیفارم سول کوڈ کے نام سے اس کی بھی ایک باقاعدہ دفعہ شامل کردی گئی۔ یہ دستور کی دفعہ ۴۴ ہے جو اس کے رہنما اصولوں کے تحت درج کی گئی ہے۔

دستور: غیرضروری طوالت

دستور ایک اعلیٰ قانونی دستاویز ہے۔ دستور کا مقصد ان بنیادی اصولوں کا تعین ہے جس کی روشنی میں قومی حکومت (یا کسی اجتماعی ادارہ) کو چلایا جا سکے۔ خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے دستور کو مختصر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ دستور جتنا لمبا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس میں اختلافات پیدا ہوں گے اور بار بار اس میں ترمیم کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس طرح دستور کا احترام ختم ہو جائے گا۔ حتی کہ طوالت اور پیچیدگی کی بنا پر آخر کار ایسا ہوگا کہ صرف کچھ ماہرین دستور ہی اس کو جانیں گے۔ عام شہریوں کو اس سے کوئی واقفیت یا دلچسپی باقی نہ رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ بین اقوامی شہرت کے ماہر دستوریات (constitutionalism) وسکانسن یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ فلمین (David Fellman) سے لے کر انڈیا کے سب سے بڑے ماہر دستور مسٹر نانی پالکھی والا تک نے مختصر دستور کی حمایت کی ہے۔

موجودہ زمانہ میں تمام ترقی یافتہ قوموں کے دستور نہایت مختصر ہیں۔ مثلاً غیر ترقی یافتہ ریاست جارجیا (Georgia) کا نظرثانی شدہ دستور پانچ لاکھ (500,000) الفاظ پر مشتمل ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ امریکہ (United States) کا دستور صرف سات ہزار الفاظ پر مبنی ہے۔ اسی طرح جاپان کا دستور انتہائی مختصر ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ قوموں کے درمیان نمبر ایک قوم کی حیثیت حاصل ہے (5/85-86)

انڈیا کا دستور غالباً تمام قومی دستوروں میں سب سے زیادہ لمبا ہے۔ بارہ تفصیلی شیڈول (schedules) کے علاوہ اصل دستور ۳۹۵ دفعات پر مشتمل ہے۔ جب کہ اکثر دفعات کی ذیلی دفعات

بھی ہیں۔اس لمبی دستور سازی کا نادرست ہونا اسی سے ثابت ہے کہ نومبر ۱۹۴۹ کے بعد سے اب تک اس میں تقریباً ۸۰ ترمیمات ہو چکی ہیں اور مزید ترمیم کا مطالبہ جاری ہے۔ان سب کے باوجود یہ "جامع" دستور ملک کو ترقی کے راستہ پر آگے لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد انڈیا کی دستور ساز اسمبلی کے صدر (۱۹۴۶-۴۹) تھے۔یہ دستور اگرچہ انھیں کی زیر صدارت بنا اور اس کی تکمیل کے بعد انھوں نے ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ کو اس پر اپنا دستخط کیا۔ تاہم وہ لمبی دستور سازی کے خلاف تھے :

In his valedictory address to the constituent Assembly Dr Rajendra Prasad said that everything cannot be written in the Constitution and hoped for the development of healthy conventions. But these have not been developed and everything has to be written in the Constitution.

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دستور ساز اسمبلی میں اپنا الوداعی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ دستور میں ہر چیز لکھی نہیں جا سکتی۔انھوں نے امید ظاہر کی کہ صحت مند روایات قائم کی جائیں گی۔لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس یہ ذہن بن گیا کہ ہر چیز کو دستور میں لکھ دیا جائے (ہندستان ٹائمس ۲۴ مئی ۱۹۹۵)

کسی دستور کی غیر ضروری طوالت اس میں غیر ضروری دفعات کو شامل کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہندستانی دستور میں اس قسم کی کثیر غیر ضروری دفعات شامل ہیں انھیں میں سے ایک ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں (directive principles) کی دفعہ ۴۴ ہے جو مشترک سول کوڈ سے متعلق ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ ریاست اس بات کی کوشش کرے گی کہ انڈیا کے تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ حاصل ہو جائے :

The State shall endeavour to secure for the citizens a uniform civil code throughout the territory of India.

دستور کی یہ دفعہ اتنا ہی غیر دستوری ہے جتنا یہ کہنا کہ ریاست اس بات کی کوشش کرے کہ ملک کے تمام شہریوں کے لیے یکساں فہرست طعام (uniform menu) وجود میں آجائے۔جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ ملک کے تمام مرد و عورت اور بوڑھے اور بچے ایک ہی قسم کا کھانا کھائیں اور ایک ہی قسم کا لباس پہنیں۔اسی طرح یہ بھی یقینی طور پر ممکن نہیں ہے کہ ایک بڑے ملک کے تمام مرد و عورت

ایک ہی ڈھنگ پر شادی کی رسوم ادا کریں، خواہ اس کے لیے باقاعدہ قانون کیوں نہ بنادیا جائے۔

دستور کا کام قومی پالیسی کے بنیادی اصولوں کو متعین کرنا ہے نہ کہ نجی معاملات میں لوگوں کے انفرادی ذوق کو مٹاکر غیر ضروری طور پر یکسانیت لانے کی کوشش کرنا۔

تاہم جب کوئی چیز لکھ کر چھاپ دی جائے تو بہت سے لوگ اس کو واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ یہی حال دستور کی اس دفعہ کا بھی ہوا ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس کا حوالہ دے کر مانگ کرتے رہتے ہیں کہ یکساں سول کوڈ کا دور لانے کے لیے پارلیمنٹ ایک قانون بنائے اور اس کو پورے ملک میں رائج کیا جائے۔

نہرو رپورٹ

پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کا ذہن کافی پہلے سے چلا آرہا ہے۔ غالباً اس کا اظہار سب سے پہلے ۱۹۲۸ میں نہرو رپورٹ کی صورت میں ہوا۔ نہرو رپورٹ حقیقۃً آزاد ہندستان کے دستور کا ایک پیشگی ڈرافٹ تھا جس کو مشہور ماہر قانون موتی لال نہرو نے تیار کیا تھا۔ اس دستوری مسودہ میں تجویز کیا گیا تھا کہ آزاد ہندستان میں شادی بیاہ کے معاملات کو یکساں ملکی قانون کے تحت لایا جائے گا۔ اس وقت علماء نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مزید یہ ہوا کہ اس وقت کی برٹش حکومت نے بھی اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس میں ہندستان کے لیے درجۂ مستقرہ (dominion status) کی بات کہی گئی تھی جو انگریزوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۲۹ میں اس پر غور کرنے کے لیے کانگرس کا ایک اجلاس لاہور میں بلایا گیا۔ اس اجلاس نے اس کے عملی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد نہرو رپورٹ کو رد کردیا۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ

۱۹۸۵ سے یکساں سول کوڈ کے مسئلہ نے نئی قانونی اہمیت اختیار کرلی جب کہ سپریم کورٹ کے ججوں نے اس کے حق میں اپنی رائے دینا شروع کردیا۔

اس معاملہ میں عدالتی بحث کا آغاز سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق چیف جسٹس مسٹر وائی وی چندراچوڑ کے فیصلہ سے ہوتا ہے۔ ۱۹۸۵ میں انھوں نے محمد احمد۔ شاہ بانو کیس میں اپنا مشہور فیصلہ دیا تھا۔ اس فیصلہ میں اصل زیر بحث معاملہ سے تجاوز کرتے ہوئے انھوں نے یہ کہنے کی بھی ضرورت محسوس کی

کہ دستور کی دفعہ ۴۴ کے تحت قانون بنانا وقت کا تقاضا ہے۔ اور یہ کہ ایک کامن سول کوڈ قومی ایکتا کو لانے میں مددگار ہوگا :

a common civil code will help the cause of national integration.

اس کے بعد اسی ۱۹۸۵ میں سپریم کورٹ کے جسٹس چن نپا ریڈی نے ایک کیس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیس ایک اور مثال ہے جو اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ یکساں سول کوڈ ہماری فوری اور ناگزیر ضرورت بن چکا ہے :

The present case is yet another which focuses...on the immediate and compulsive need for a uniform civil code.

یہی بات زیادہ مفصل اور تاکیدی انداز میں سپریم کورٹ کی دورکنی ڈویژن بنچ نے مئی 1995 میں اپنے متفقہ فیصلہ میں کہی ہے۔ اس کے ممبران جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس آر ایم سہائے تھے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ دستور کی دفعہ ۴۴ کے مطابق، یونیفارم پرسنل لا کو نافذ کرنا قومی استحکام کی طرف ایک فیصلہ کن قدم ہے۔ اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے کہ کسی بھی وجہ سے ملک میں یونیفارم پرسنل لا کے نفاذ میں تاخیر کی جائے :

to introduce a uniform personal law (is) a decisive step towards national consolidation... There is no justification whatsoever in delaying indefinitely the introduction of a uniform personal law in the country (p. 22).

دستور کی دفعہ ۴۴

یہ ساری باتیں دستور کی دفعہ ۴۴ کے حوالے سے کہی جا رہی ہیں۔ یہ دفعہ دستور ہند کے چوتھے حصہ میں ہے۔ یہ حصہ اسٹیٹ پالیسی کے لیے رہنما اصولوں (directive principles) کی حیثیت سے دستور میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کی دفعہ ۳۷ میں یہ صراحت ہے کہ اس حصہ میں جو دفعات درج کی گئی ہیں وہ کسی بھی عدالت کے ذریعہ قابل نفاذ نہیں ہیں۔ اس کا تعلق تمام تر حکومت اور ریاست سے ہے۔ ایسی حالت میں سپریم کورٹ کے ججوں کا بار بار دفعہ ۴۴ کے حوالے سے یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ چھیڑنا ایک ایسے مسئلہ میں دخل دینا ہے جس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ جنتا دل نے اس

فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے (دی پانیر ۱۵ مئی ۱۹۹۵) اس کو اپنی حد سے گزر کر پارلیمنٹ کی حد میں داخل ہونا قرار دیا:

It is a judicial trespass on Parliament's jurisdiction.

اسی پس منظر میں دی ہندستان ٹائمس (۱۲ مئی ۱۹۹۵) نے اپنے اڈیٹوریل میں فیصلہ پر تبصرہ کا آغاز اس جملہ سے کیا تھا کہ ـــــــ ہندستان کی سپریم کورٹ نے حالیہ برسوں میں بار بار یہ رجحان ظاہر کیا ہے کہ وہ ایسے مقامات میں گھس پڑتی ہے جہاں داخل ہونے سے فرشتے بھی گھبراتے ہیں:

India's Supreme Court in recent years has displayed a penchant for rushing into terrain that angels fear to tread.

خود دستور کے مطابق، یونیفارم سول کوڈ کو ایکٹ کی صورت دینے کا تعلق تمام تر حکومت سے ہے۔ اور حکومت کا حال یہ ہے کہ ۱۹۵۶ میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے صاف طور پر کہا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ وقت آگیا ہے کہ میں اس کو تکمیل تک پہنچاؤں:

I do not think that at the present moment the time is ripe in India for me to try to push it through.

یہی بات اس کے بعد اندرا گاندھی نے بھی کہی۔ اور اب موجودہ پرائم منسٹر پی وی نرسمہا راؤ نے بھی یہی بات کہہ دی ہے (ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۲۸ جولائی ۱۹۹۵، صفحہ ۷) اب یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو عملاً یونیفارم سول کوڈ لانا ہے وہ تو اس سے بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اختیار میں سرے سے اس کا معاملہ نہیں وہ اس کے حق میں پر جوش تقریریں کر رہے ہیں۔ اس قسم کی لفظی کارروائی صرف وقت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مذہبی آزادی ایک لازمی حق

جو لوگ دستور کی دفعہ ۴۴ کا حوالہ دے کر یونیفارم سول کوڈ کی وکالت کرتے ہیں۔ انھوں نے غالباً اس پر بہت کم غور کیا ہے کہ خود اسی دستور کی دفعہ ۲۵ میں اس کی تردید موجود ہے۔ دستور ہند کی دفعہ ۲۵ میں ہندستان کے ہر شہری کو ضمیر اور مذہبی عمل اور مذہبی تبلیغ کی پوری آزادی دی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تمام افراد مساوی طور پر آزادیٔ ضمیر کا حق رکھتے ہیں۔ ان کو حق ہے کہ وہ آزادانہ طور پر مذہب کا اقرار کریں، اس پر عمل کریں اور اس کی تبلیغ کریں:

All persons are equally entitled to freedom of conscience and the right freely to profess, practise and propagate religion.

مذہب کا یہ انتخاب فرد یا گروہ کی خود اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ اسی لیے دفعہ ۲۵ کی تشریح (explanation I) میں کہا گیا ہے کہ سکھوں کی مذہبی آزادی میں ان کا یہ حق بھی شامل ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے ساتھ کرپان (تلوار) رکھیں۔ دستور میں "کلچرل رائٹس" کے تحت عمومی طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ہندستانی شہریوں کا کوئی بھی طبقہ جو اپنا الگ کلچر اور زبان رکھتا ہو، اس کو حق ہوگا کہ وہ اپنے کلچر اور زبان کی حفاظت کرے (دفعہ ۲۹)

مزید یہ کہ مذہبی آزادی کی دفعہ جو دستور میں ہے وہ دستور کے اس حصہ میں ہے جس کا تعلق شہریوں کے بنیادی حقوق (fundamental rights) سے ہے، جب کہ مذکورہ دفعہ ۴۴ دستور میں دیے ہوئے رہنما اصول (directive principles) کے تحت آئی ہے۔ اور خود دستور کی دفعہ ۳۷ کے مطابق، اس کے رہنما اصولوں کی دفعات اس کے بنیادی حقوق کی دفعات کے تابع ہیں نہ کہ اس سے آزاد۔

ایسی حالت میں دستور کی دفعہ ۴۴ کا حوالہ دے کر حکومت سے یہ کہنا کہ وہ یکساں سول کوڈ کو بذریعہ قانون ملک میں نافذ کرے، خود دستور کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ جب تک ملک میں کوئی گروہ ایسا موجود ہے جو اس قسم کی قانون سازی کو اپنے مذہب میں بے جا مداخلت قرار دیتا ہے، اس وقت تک خود دستور کی رو سے ایسا قانون بنانا ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی پارلیمنٹ ایسا قانون بنائے اور ملک کا کوئی مذہبی گروہ اس کے خلاف سپریم کورٹ میں مرافعہ کرے تو عدالتِ عالیہ جو دستور کی محافظ ہے، وہ یقینی طور پر ایسے قانون کو کالعدم قرار دے دے گی۔

دستور ہند میں مذہبی آزادی کی دفعہ کوئی سادہ بات نہیں ہے۔ یہ انسانی حقوق کے اس عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) کے تحت ہے جس کو اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ میں جاری کیا تھا، اور جس کا ایک مستقل ممبر ہندستان بھی ہے۔ اس منشور کے آرٹیکل ۱۸ میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ہر آدمی کو مذہب کی آزادی ہوگی۔ اس میں مذہب بدلنے کی آزادی اور اپنے پسندیدہ مذہب پر عمل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

ہندستان نے اس عالمی منشور پر قومی حیثیت سے اپنا دستخط ثبت کیا ہے۔ اس طرح مذہبی آزادی ہر ہندستانی شہری کا ایک ایسا حق بن جاتی ہے جس کو کسی بھی حال میں ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

مذہب اور پرسنل لا

سپریم کورٹ کی مذکورہ دو رکنی ڈویژن بنچ کے ۱۳ صفحہ کے فیصلہ (مئی ۱۹۹۵) میں اس قسم کی قانون سازی کا جواز یہ کہہ کر نکالا گیا ہے کہ نکاح وطلاق کے معاملہ کا تعلق مذہب سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ملکی قانون سے ہے۔ جسٹس کلدیپ سنگھ اپنے فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ دستور کی دفعہ ۴۴ اس تصور پر بنی ہے کہ مہذب سماج میں مذہب اور پرسنل لا کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں۔ اس کی دفعہ ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے جب کہ دفعہ ۴۴ سماجی تعلقات اور پرسنل لا کو مذہب سے الگ کر رہی ہے:

> Article 44 is based on the concept that there is no necessary connection between religion and personal law in a civilised society. Article 25 guarantees religious freedom whereas Article 44 seeks to divest religion from social relations and personal law.

یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ مذہب کا تعلق، تمام علماء مذہب کے اتفاق کے مطابق، تین چیزوں سے ہے۔ عقیدہ، عبادت، اخلاقی اقدار (ethical values) اور اخلاقی اقدار میں بلاشبہ یہ بات سرفہرست ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان جائز جنسی تعلق کی صورت کیا ہو۔ نکاح کا تعلق اسی اخلاقی مسئلہ سے ہے، اس لیے وہ لازمی طور پر مذہب میں شامل ہے۔

مذہب اور پرسنل لا کا یہ تعلق اتنا زیادہ واضح ہے کہ خود ڈویژن بنچ کے اسی فیصلہ میں اس کا اعتراف موجود ہے۔ چنانچہ بنچ کے دوسرے رکن جسٹس آر این سہائے اپنے علاحدہ فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ شادی، وراثت، طلاق، کنورزن اپنی نوعیت اور حیثیت میں اتنا ہی مذہبی ہیں جتنا کہ عقیدہ۔ آگ کے کنارے سات پھیرا کرنا یا قاضی کے سامنے ایجاب و قبول کرنا بھی اتنا ہی عقیدہ اور ضمیر کا مسئلہ ہے جتنا کہ خود عبادت:

> Marriage, inheritance, divorce, conversion are as much religious in nature and content as any other belief or faith. Going round the fire seven rounds or giving consent before Qazi are as much matter of faith and conscience as the worship itself.

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دلیل سے نکاح کے معاملہ کو مذہب سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب نکاح و طلاق کا معاملہ مذہب کا معاملہ ہے تو دستور کی دفعہ ۲۵ کے مطابق، کسی بھی پارلیمنٹ یا کسی بھی ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی گروہ کے اس مسلّمہ حق کو اس سے چھین لے اور اس کی مرضی کے بغیر اس کے اوپر ایسا قانون نافذ کرے جو مذکورہ دفعہ کے مطابق، اس کے مذہبی معاملہ میں مداخلت کے ہم معنی ہو۔

کامن کوڈ اور قومی ایکتا

کامن سول کوڈ کا مقصد کیا ہے۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہے گا کہ کامن کوڈ برائے کامن کوڈ (common code for the sake of common code) ہمارا مقصد ہے۔ پھر اس کا اصل مقصد کیا ہے، اس کے تمام وکیل متفقہ طور پر اس کا ایک ہی فائدہ بتاتے ہیں۔ وہ یہ کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں باہمی قربت پیدا ہوگی۔ اور مشترک قومیت کو وجود میں لانے میں مدد ملے گی۔ کامن کوڈ لوگوں کے اندر کامن فیلنگ پیدا کرے گا۔ اس طرح وہ مضبوط انڈین نیشن وجود میں آجائے گی جس کا پچاس سال سے ہم کو انتظار ہے۔

مگر یہ محض قافیہ بندی کی بات ہے۔ صرف لفظی اشتراک کی بنا پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کامن کوڈ سے کامن فیلنگ کا ظہور ہوگا۔ حالاں کہ دونوں میں کوئی لازمی رشتہ نہیں۔ تمام متعلق حقائق اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔

جسٹس کلدیپ سنگھ اپنے فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ حکومت نے ہندوؤں کے روایتی قانون کو کوڈ کی صورت دینے کی کوشش کی ہے۔ ہندو میریج ایکٹ ۱۹۵۵، ہندو سکسشن ایکٹ ۱۹۵۶، ہندو مائناریٹی اینڈ گارجین شپ ایکٹ ۱۹۵۶، ہندو اڈاپشن اینڈ مینٹننس ایکٹ ۱۹۵۶ بنایا جا چکا ہے۔ ان قوانین نے روایتی ہندو قانون کی جگہ لے لی ہے جو کہ مختلف مکاتب فکر اور مذہبی کتابوں پر مبنی تھا۔ ان جدید قوانین نے ان سب کو ایک یونیفارم کوڈ کی حیثیت دے دی ہے۔ جب ۸۰ فی صد سے زیادہ شہری پہلے ہی سے مشترک پرسنل قانون کے تحت لائے جا چکے ہیں تو اب اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے کہ ہندستان کے تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کو مزید التوا میں ڈالا جائے (صفحہ ۲)

جسٹس کلدیپ سنگھ مزید لکھتے ہیں کہ آخر حکومت کو کتنا زیادہ وقت چاہیے کہ وہ دستور ہند کی

دفعہ ۴۴ کے تحت دی ہوئی ہدایت کی تعمیل کرے۔ ہندوؤں کا روایتی قانون، ہندوؤں کا پرسنل لا جس کا تعلق وراثت، جانشینی اور شادی بیاہ سے ہے، بہت پہلے ۵۶ - ۱۹۵۵ میں قانونی کوڈ کی صورت اختیار کر چکا۔ اب کسی بھی قسم کا کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے کہ ملک میں یونیفارم پرسنل لا کے نفاذ میں غیر متعین تاخیر کی جائے۔ ہندوؤں کا پرسنل لا، جس کا تعلق شادی، جانشینی وغیرہ سے ہے، وہ سب اسی طرح مقدس سمجھے جاتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں یا عیسائیوں کے قانون۔ مگر ہندو اور ان کے ساتھ سکھ، بدھسٹ اور جینی فرقہ نے قومی اتحاد اور استحکام کی خاطر اپنے جذبات کو بھلا دیا۔ تاہم کچھ اور فرقوں نے ابھی ایسا نہیں کیا ہے، اگرچہ دستور پورے ہندستان میں ایک ہی کامن سول کوڈ نافذ کرنے کی تاکید کرتا ہے (صفحہ ۲۱ - ۲۲)

جسٹس کلدیپ سنگھ کے فیصلہ کا جو اقتباس ہم نے اوپر نقل کیا ہے اس موصوف کے نزدیک ملک کی بہت بڑی اکثریت (۸۰ فی صد سے زیادہ) اس مشترک عائلی قانون کے تحت بالفعل لائی جا چکی ہے جس کے لیے وہ مکمل قسم کا یکساں پرسنل قانون بنانے کی پُرزور وکالت کر رہے ہیں۔ پھر جب آبادی کی اتنی بڑی اکثریت میں مطلوب قانون عملاً آ چکا ہے تو اس کے وہ مثبت نتائج کہاں ہیں جو اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج بھی ہر سطح پر قومی یک جہتی کا فقدان ہے۔ لوگوں میں کوئی نیشنل کیرکٹر نہیں۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اجلاس کے دوران ایسے ہنگامے ہوتے ہیں کہ کارروائی کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گاؤں پنچایتوں میں پہلے سے بھی زیادہ جھگڑے ہو رہے ہیں۔ عدالتوں میں نزاعی مقدمات کی بھرمار ہے۔ دو مختلف فرقوں سے بھی زیادہ ایک ہی فرقہ کے مختلف طبقات میں ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ اکثر ریاستوں میں علاقائی ہنگامے جاری ہیں۔ حتیٰ کہ کئی ریاستوں میں علاحدگی کی متشددانہ تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کا سول قانون ایک ہی ہے۔ مگر ان جماعتوں نے اتنے بڑے پیمانہ پر باہمی لڑائی جاری کر رکھی ہے کہ ملک کا استحکام شدید طور پر خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ خود سپریم کورٹ کے مذکورہ جج صاحبان کے فیصلہ کے مطابق، اصل مسئلہ کامن کوڈ کے نفاذ کا نہیں ہے، بلکہ کامن کوڈ کے نفاذ کے باوجود نتیجہ نہ نکلنے کا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں چاہیے کہ ہم دوسری تدبیر تلاش کریں نہ کہ ناکام ہو جانے والی تدبیر کے مزید بے سود اعادہ پر اپنا وقت ضائع کریں۔

باہمی تفریق برٹش کی دین

آج جس "کامن فیلنگ" کی بات کی جارہی ہے وہ اس سے پہلے صدیوں سے ہمارے ملک میں پوری طرح موجود تھی۔ ملک کے مختلف فرقے مل جل کر محبت کے ساتھ باہم زندگی گزارتے تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں کامن سول کوڈ جیسی کسی چیز کا سرے سے کوئی وجود نہ تھا۔ ہر فرقہ کی کلچرل شناخت الگ تھی اور ہر ایک اپنی اپنی مذہبی روایت کے مطابق شادی بیاہ کی رسوم ادا کرتا تھا۔ پھر بھی وہ چیز پوری طرح موجود تھی جس کو قومی یک جہتی کہا جاتا ہے۔

ہندستانی سماج کے اس توازن کو جس چیز نے برہم کیا وہ کوئی غیر کامن کوڈ نہیں تھا، بلکہ سابق برٹش حکومت کی وہ پالیسی تھی جس کو سابق لفٹنٹ جنرل کوک (General Coke) نے فارمولے کی صورت دیتے ہوئے کہا تھا کہ لڑاؤ اور حکومت کرو :

Divide and rule

اس غیر مطلوب صورت حال کا ابتدائی آغاز لارڈ ایلگن (James Bruce Elgin) کے زمانہ میں ہوا جو ۱۸۶۲-۶۳ میں ہندستان کا وائسرائے تھا۔ برٹش گورنمنٹ کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر وڈ (Wood) نے لندن سے نئی دہلی میں مقیم وائسرائے کو خط لکھا کہ :

> We have maintained our power in India by playing off one part against the other and we must continue to do so. Do all you can, therefore, to prevent all having a common feeling.

ہم نے ہندستان میں اپنا اقتدار وہاں کے ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے خلاف لڑا کر باقی رکھا ہے۔ ہمیں ایسا کرتے رہنا چاہیے۔ اس لیے لوگوں کو مشترک احساس سے روکنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرو (دی ہندستان ٹائمس ۳۰ مارچ ۱۹۹۵)

برٹش حکمرانوں کی یہی سوچی سمجھی پالیسی تھی جس نے ہندستان کی بنی بنائی مشترک قومیت کو بکھیر دیا۔ انھوں نے ہر موقع کو استعمال کر کے لوگوں کے درمیان نفرت کو بھڑکایا۔ انھوں نے حکومت کے تمام ذرائع سے کام لے کر باہمی نفرت کا ایک مصنوعی جنگل اگا دیا۔ بدقسمتی سے آزادی کے بعد بھی یہ آگ بجھائی نہ جا سکی۔ اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یہی اس کی اصل وجہ ہے۔ اس کے علاوہ یونیفارم سول کوڈ کے ہونے یا نہ ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یکساں کوڈ یکسانیت کا ذریعہ نہیں

یکساں کوڈ کا کوئی بھی تعلق یکسانیت یا باہمی اتحاد سے نہیں۔ ایک ہی سول کوڈ کو اپنانے والے بار بار آپس میں لڑتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، قدیم ہندستان میں کورو اور پانڈو دو رشتہ دار خاندان تھے، دونوں کا سول کوڈ ایک تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں وہ عظیم جنگ ہوئی جس کو مہا بھارت کہا جاتا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اعلان کیا ہے کہ دہلی کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے اگلے الکشن میں وہ قاتلانہ جبلت (killer instinct) کے ساتھ مہا بھارت برپا کرے گی (ٹائمس آف انڈیا ۴ جولائی ۱۹۹۵) اس نئی مہابھارت کے دونوں فریق دوبارہ وہی لوگ ہیں جن کا سول کوڈ بالکل یکساں ہے۔

پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) میں ایک طرف جرمنی اور اٹلی وغیرہ تھے، اور دوسری طرف برطانیہ اور فرانس وغیرہ۔ دونوں گروہوں میں ہلاکت خیز جنگ ہوئی۔ حتی کہ مرنے اور شدید طور پر زخمی ہونے والوں کی تعداد ۳۰ ملین تک پہنچ گئی۔ یہ دونوں جنگ آزما فریق عیسائی تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے یہاں وہی سول کوڈ رائج تھا جو کہ دوسرے کے یہاں رائج تھا۔ مگر یہ قانونی یکسانیت دونوں کو آپس میں لڑنے سے روکنے والی ثابت نہیں ہوئی۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۵-۱۹۳۹) میں ایک فریق کا قائد جرمنی تھا، اور دوسرے فریق کا قائد برطانیہ۔ دونوں کا کلچر اور سول کوڈ ایک تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف تاریخ کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ لڑی۔ دونوں کا "یکساں سول کوڈ" کو ماننا انھیں باہمی جنگ سے روکنے والا نہ بن سکا۔

سابق وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کو ۱۹۸۴ میں کچھ لوگوں نے مار ڈالا، جبکہ قاتل اور مقتول دونوں کا سول کوڈ ایک تھا۔ پنجاب میں علٰحدگی کی خونیں لڑائی جن دو فریقوں کے درمیان جاری ہوئی وہ دونوں ایک ہی سول کوڈ کو ماننے والے تھے۔ ہر دن اخبار میں شوہروں اور بیویوں کے درمیان ظالمانہ سلوک کے واقعات چھپتے رہتے ہیں، جبکہ دونوں کے دونوں ایک ہی سول قانون سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ عدالتوں میں کروروں ہندستانی ایک دوسرے کے خلاف سنگین الزامات لگا کر قانونی لڑائی لڑ رہے ہیں، حالاں کہ بیشتر حالت میں دونوں فریقوں کا سول کوڈ ایک ہی ہوتا ہے۔ وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کے لیے یکساں سول کوڈ کا بے فائدہ ہونا آج ہی معلوم اور ثابت شدہ ہے۔ کوئی نیا قانون بنا کر از سر نو اس کا مزید تجربہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

دانشوران قوم کا ردعمل

سپریم کورٹ آف انڈیا کی ڈویژن بنچ کا فیصلہ (۱۰ مئی ۱۹۹۵) اخباروں میں چھپا تو برادران وطن اور دانشوران قوم کا ردعمل کثرت سے سامنے آیا۔ ایک طبقہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کو اس طرح لیا گویا کہ یہ ملک کے موجودہ سماجی مسائل کا کوئی حتمی حل ہے۔ تاہم ان میں قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنھوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اور کسی ایک یا دوسری وجہ سے اس کو رد کر دیا۔ اس دوسرے طبقہ کے چند حوالے حسب ذیل ہیں۔

1. Politics of Uniform Civil Code
   by Partha S. Ghosh
   The Hindustan Times, New Delhi, May 22, 1995
2. Living with Religion
   by Kuldip Nayyar
   The Statesman, New Delhi, May 31, 1995
3. Uniform Civil Code: Judiciary Oversteps its Brief
   by H.M. Seervai
   The Times of India, New Delhi, July 5, 1995
4. Personal Laws: Uniformity no Essential
   by Balraj Puri
   Indian Express, New Delhi, July 6, 1995
5. Civil Code: The Constitutional Perspective
   by K.C. Markandan
   The Hindustan Times, New Delhi, June 19, 1995.

نمونہ کے طور پر مسٹر بلراج پوری کے مذکورہ مضمون کے کچھ حصے یہاں اصل انگریزی میں نقل کیے جارہے ہیں۔ انھوں نے کامن سول کوڈ کے تصور کو پوری طرح رد کر دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ :

سپریم کورٹ کے معزز ججوں نے قومی اتحاد کا جو تصور پیش کیا ہے اور اس کی حمایت میں انھوں نے جو دلائل دیے ہیں، اس پر میرا اعتراض بہت بنیادی ہے۔ میرے نزدیک جج صاحبان، قومی تعمیر کے عمل میں برعکس طور پر اثر انداز ہوئے ہیں، ہندستانی قوم کے مشترک کردار پر اور مسلمانوں کے درمیان نیز مسلمانوں اور دوسرے فرقوں، خاص کر ہندوؤں کے ساتھ ڈائیلاگ پر جو کہ اس کے پرسنل لا کی اصلاح کے سوال پر جاری تھا۔ یہ کہہ کر کہ مسلم پرسنل لا کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کو یکساں قانون کا حصہ نہ بنایا جائے، جج صاحبان نے مسلم خواتین کے معاملہ کو مسلمانوں کے علاحدہ تشخص کے تابع کر دیا ہے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک اچھے مقصد کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔

یکسانیت اور اصلاح کے درمیان قطعی طور پر کوئی بھی منطقی ربط نہیں۔ اول الذکر کے خلاف کیس اتنا ہی ناقابل تردید ہے جتنا کہ وہ مؤخر الذکر کے معاملہ میں ہے۔ یکساں سول کوڈ، قومی اتحاد اور استحکام کے فروغ کے لیے کوئی قطعی چیز نہیں، جیسا کہ جج صاحبان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دستور ہند کی اسٹیٹ لسٹ میں ۶۶ اندراجات ہیں اور کانکرنٹ لسٹ میں ۴۷ اندراجات ہیں، جن کے معاملہ میں ریاستوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ الگ الگ قوانین بنا سکتی ہیں، اور ان میں یکسانیت ضروری نہیں ہے۔ اگر ریاستوں کی جغرافی اور ثقافتی عدم یکسانیت کی بنیاد پر بنائے جانے والے غیر یکساں قوانین ملک کے اتحاد کے لیے خطرہ نہیں ہیں تو غیر جغرافی نوعیت کے مذہبی گروہوں میں عدم یکسانیت سے وہ کیوں خطرہ بن جائیں گے۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کوئی فرقہ مذہب کی بنیاد پر اپنے لیے علٰحدہ وجود کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ مگر کیا ہم نے زبان کی بنیاد پر علٰحدہ وجود کا اقرار نہیں کیا ہے اور زبان کی بنیاد پر از سر نو ملک کی تنظیم نہیں کی ہے۔ کیا منڈل اصول کے تحت ذات کی بنیاد پر تشخص کو سیاسی جواز نہیں دیا گیا ہے۔ پھر معزز جج کیوں استثنائی طور پر صرف مذہبی گروہ کو علٰحدہ تشخص کا حق دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ ایک غیر منطقی روش ہے، اور سماجی اور سیاسی اعتبار سے مسلّمہ حقائق کے خلاف ہے۔ کیا یہ تشخص محض ایک جج کے اعلان سے ختم ہو جائے گا۔ (انڈین اکسپریس ۶ جولائی ۱۹۹۵)

There is absolutely no logical connection between umiformity and reform. The case against the former is as unassailable as it is for the latter. Nor is uniform law imperative, as the judges argue, for the promotion of national unity and solidarity. There are a number of 66 entries in the State List and 47 in the Concurrent List of the Constitution on which States are empowered to make laws without any obligation to conform to uniformity. If diversity of laws, based on geographical and cultural diversities of the States, has not threatened the unity of the country, would it be threatened only if the diversities are of non-territorial form as are religious communities?

Justice Kuldip Singh has proclaimed that no community could claim to remain a separate entity on the basis of religion. Have not we conceded separate entities based on languages and reorganised the country on a linguistic basis? Have not caste-based identities been recognised in the Mandal principle and all identities, cultural, tribal, caste and religious acquired political legitimacy? Why does the honourable judge single out the claim of a religious community for a distinct identity? It defies logic and socially and politically the accepted reality. Can this identity disappear by a mere pronouncement of a judge?

گرو گولوالکر کے خیالات

آر ایس ایس کے سابق سرسنچالک گرو گولوالکر نے ۲۰ اگست ۱۹۷۲ کو دہلی میں دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قومی اتحاد کے لیے یکساں سول کوڈ کوئی ضروری چیز نہیں۔ ان کی یہ تقریر مدرلینڈ (۲۱ اگست ۱۹۷۲) میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ہفت روزہ آرگنائزر (۲۶ اگست ۱۹۷۲) میں اس موضوع پر ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا۔ یہ رپورٹ انگریزی میں اگلے صفحات میں درج کی جا رہی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا:

میں نہیں سمجھتا کہ نیشنلزم کا احساس پیدا کرنے کے لیے ہمیں یکساں سول کوڈ کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی قانونی یکسانیت کا قومی اتحاد سے کوئی تعلق نہیں۔ انڈیا ہمیشہ تنوع کا ملک رہا ہے۔ اس کے باوجود لمبی مدت سے ہم ایک طاقتور اور متحد قوم بنے رہے۔ اتحاد کے لیے ہمیں ہم آہنگی کی ضرورت ہے نہ کہ یکسانیت کی۔ میرا احساس یہ ہے کہ فطرت زیادہ یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ ہمارے پاس زندگی کا بہت لمبا تجربہ ہے اور ہمارا تجربہ یہ ہے کہ تنوع اور اتحاد دونوں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دستور ہند میں ایک دفعہ یکساں سول کوڈ کے حق میں موجود ہے۔ مگر ایک چیز محض اس لیے پسندیدہ نہیں ہو جاتی کہ وہ کسی دستور میں لکھی ہوئی ہے۔ بہر حال ہمارا دستور کچھ بیرونی دستوروں کا ملغوبہ ہے۔ اس کو ہندستانی تجربات کی روشنی میں نہیں بنایا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمان یکساں سول کوڈ کے مخالف ہیں، کیوں کہ وہ اپنا علحدہ تشخص باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی بھی طبقہ یا فرقہ جو اپنا الگ تشخص چاہتا ہو اس سے میرا کوئی جھگڑا نہیں، جب تک یہ تشخص حب وطن کے جذبات کو گھٹانے والا نہ ہو۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ احساسات ہوں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو اپنے طریق زندگی پر رہنے کا پورا حق ہے، البتہ انھیں ملک سے اور اس کے کلچر سے محبت کرنا چاہیے۔ ہندوؤں کے لیے بھی یکساں سول قانون بنانا غیر ضروری ہے۔ آخر ہزاروں سال سے ہندو اس قسم کے فرق کے باوجود مل جل کر رہ رہے ہیں۔

کسی کو یہ بات فلسفیانہ معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یکسانیت قوموں کے لیے موت کی نشانی ہے۔ فطرت یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ میرے نزدیک ہر طریق زندگی کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ البتہ ان تمام تنوعات کو قومی اتحاد میں مددگار ہونا چاہیے۔

Q. Don't you thing that Muslims are opposing a uniform civil code only because they want to maintain their separate identity?

A. I have no quarrel with any class, community or sect wanting to maintain its identity, so long as that identity does not detract from its patriotic feeling. I have a feeling that some people want a uniform civil code because they think that the right to marry four wives is causing a disproportionate increase in the Muslim population. I am afraid this is a negative approach to the problem.

The real trouble is that there is no feeling of brotherliness between Hindus and Muslims. Even the secularists treat the Muslims as a thing apart. Of course their method is to flatter them for their bloc votes. Others also look upon them as a thing apart, but they would like to flatten out the Muslims by removing their separate identity. Basically there is no difference between the flatterers and the flatteners. They both look upon Muslims as separate and incompatible.

My approach is entirely different. The Muslim is welcome to his way of life so long as he loves this country and its culture. I must say the politicians are responsible for spoiling the Muslims. It was the Congress which revived the Muslim Leage in Kerala and thus caused the increase of Muslim communalism throughout the country.

Q. If we carry this argument backwards, even the codification of the Hindu law would be considered unnecessary and undesirable.

A. I certainly consider the codification of Hindu law as altogether unnecessary for national unity and national integration. Throughout the ages we had countless codes—and we were not any the worse for them. Till recently Kerala had the matriarchal system. What was wrong with that? All law-givers, ancient and modern, are agreed the custom does, and must, prevail over the law.

"Custom is more effective than shastras", say the shastras. And custom is the local or group code. All societies recognise the validity of the local custom or code.

Q. If a uniform civil law is not necessary, why is a uniform criminal law necessary?

A. There is a difference between the two. The civil law concerns mainly the individual and his family. The criminal law deals with the law and order and thousand other things. It concerns not only the individual but also the society at large.

Q. Would it really be correct to allow our Muslim sisters to remain in purdah and be subjected to polygamy?

A. If your objection to Muslim practices is on humanitarian grounds, then that becomes a valid objection. A reformist's attitude in these matters is allright. But a mechanical leveller's attitude would not be correct. Let the Muslims evolve their old laws. I will be happy when they arrive at the conclusion that polygamy is not good for them, but I would not like to force my view on them.

Q. This seems to be a deep philosophical question.

A. It very much is. I think uniformity is the death-knell of nations. Nature abhors uniformity. I am all for the protection of various ways of life. However, all this variety must supplement the unity of the nation and not range itself against it.

(Reproduced from *Manthan Monthly*, New Delhi, July 1986)

Golwalkar on Uniform Civil Law

On August 20, 1972, Shri Guruji, Sarsanghachalak, RSS, inaugurated the Deendayal Research Institute in Delhi. On this occasion he said that a uniform civil code was not necessary for national unity. *The Motherland* of New Delhi carried the following report on August 21, 1970

> New Delhi, August 20—Shri M.S. Golwalkar, Sarsanghachalak of Rashtriya Swayamsevak Sangh, said here today that the present-day Indian politicians lacked original thinking on the problems of Indian society.

Shri Guruji was speaking at the inauguration of the Deendayal Research Institute and the celebration of Sri Aurobindo Centenary by the Institute. Shri R.R. Diwakar, President, Gandhi Peace Foundation, presided. A huge elite audience attended the function in front of the Institute building on Rani Jhansi Road, Jhandewala.

Citing the example of politicians' efforts to solve problems without thinking, he referred to the question of uniform civil code for all in the country, and said that such a uniformity was not necessary in itself; Indian culture permitted diversity in unity. 'The important thing is to infuse a spirit of intense patriotism and brotherhood among all citizens, Hindu and non-Hindu, and make them love this motherland according to their own religion.

In a special interview with *Organiser*, Shri Guruji reiterated his above view. Here is the substance of the conversation, as published in that paper's issue of August 26, 1972:

Q. You don't think that a uniform civil code is necessary for promoting the feeling of Nationalism?

A. I don't. This might surprise you or many others. But this is my opinion. I must speak the truth as I see it.

Q. Don't you think that uniformity within the nation would promote national unity?

A. Not necessarily. India has always had infinite variety. And yet, for long stretches of time, we were a very strong and united nation. For unity, we need harmony, not uniformity.

Q. In the West the rise of nationalism has coincided with unification of laws and forging of other uniformities.

A. Don't forget that Europe is a very young continent with a very young civilisation. It did not exist yesterday and it may not be there tomorrow. My feeling is that nature abhors excessive uniformity. It is too early to say what these uniformities will do to Western civilisation in times to come. Apart from the here and the now, we must look back into the distant past and also look forward to the remote future. Many actions have long-delayed and indirect consequences. We in this country have millennia of experience. We have a tested way of life. And our experience is that variety and unity can, and do, go together.

Q. A Directive Principle of State Policy in our Constitution says that the State would strive for a uniform civil code.

A. That is all right. Not that I have any objection to a uniform civil code, but a thing does not become desirable just because it is in a Constitution. In any case our Constitution is a hotch-potch of some foreign constitutions. It has not been conceived and drafted in the light of Indian experience.

فطرت کا نظام

ذوق دہلوی (۱۷۸۹-۱۸۵۴) اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے :

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یہ فطرت کا قانون ہے۔ آپ کسی باغ میں کھڑے ہوں تو وہاں ہر پودے اور ہر پیڑ کا انداز جدا ہوگا۔ ہر درخت کا پھول الگ الگ رنگ میں اپنی بہار دکھا رہا ہوگا، پورا باغ تنوعات کا ایک مجموعہ نظر آئے گا۔ حتی کہ چڑیاں بھی الگ الگ آوازوں میں اپنے نغمے سنا رہی ہوں گی۔ وہ کہہ رہی ہوں گی کہ خالق کو ایسا باغ پسند ہے جہاں کوئل کی کوک ہو تو بلبل کے چہچہے بھی ہوں۔ کوئی چڑیا ایک ڈھنگ کی آواز نکالے تو دوسری چڑیا کسی اور ڈھنگ سے فضا میں اپنے گیت بکھیرے۔ ہر چیز تنوع کا ایک نیا نمونہ ہو۔

یہ تنوع اس کائنات کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی طرح انسان میں بھی۔ حیاتیات اور نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ نہ صرف انگوٹھے کے نشانات بلکہ ہر آدمی کے سیل دوسرے آدمی کے سیل سے جدا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کی آنکھ دوسرے آدمی کی آنکھ سے نہیں ملتی۔ یہ اختلاف و تنوع صرف ظاہری حسن کے لیے نہیں ہے۔ اس کے اندر زبردست حکمت چھپی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی تنوع اور اختلاف سے تمام انسانی ترقیاں وابستہ ہیں۔ اسی سے نئی نئی دریافتیں سامنے آتی ہیں۔ اسی سے افکار کا تصادم ہوتا ہے جو آخر کار فکری ارتقا کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی سے باہمی چیلنج پیش آتے ہیں جو انسان کی ذہنی بیداری کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔

کسی مجلس میں تمام شرکا کی رائے ایک ہو تو اس سے کوئی نیا آئیڈیا برآمد نہیں ہوگا۔ کسی صنعتی نظام میں اگر تمام انجینیر ایک ہی مولڈ میں ڈھلے ہوئے ہوں تو وہ کسی نئی ٹکنالوجی تک نہیں پہنچ سکتے۔ کسی سماج میں اگر تمام اہل قلم یکساں ذوق کے مالک ہوں تو وہ کوئی تخلیقی ادب ظہور میں نہیں لا سکتے۔ کسی ملک کے سیاست داں اگر سب کے سب ایک ہی سانچہ میں ڈھل کر نکلے ہوں تو وہ کوئی بڑا سیاسی کارنامہ نہیں دکھا سکتے۔

تنوع اور اختلاف اس دنیا کا عام قانون ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں خود اپنے زور پر جاری و ساری ہے۔ کوئی انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ حتی کہ اگر کوئی طاقت کے زور پر اس نظام کو بدلے تو فطرت کا طوفان اس مصنوعی نظام کو توڑ کر دوبارہ اس کو تنوع کے اصول پر قائم کر دے گا۔

قابل عمل نہیں

حقیقت یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ ایک ناقابل عمل خواب ہے، اس کا داخلی ثبوت خود دستور ہند کے اندر موجود ہے۔ اس کی ایک مثال وہ ہے جو دستور کی دفعہ ۴۴ اور ۳۷۱۔ اے کے تقابل کے ذریعہ سامنے آتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، دستور کی دفعہ ۴۴ میں مقرر کیا گیا ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کے لیے بلا استثناء ایک ہی یونیفارم سول کوڈ بنایا جائے۔ مگر اسی دستور کی ترمیمی دفعہ ۳۷۱۔ اے کہتی ہے کہ ناگالینڈ میں ناگاؤں کے درمیان جو مذہبی اور سماجی قاعدے رائج ہیں اور ان کے یہاں جو مختلف روایتی قوانین ہیں، ان کے بارہ میں پارلیمنٹ کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ ریاست ناگالینڈ میں وہ بدستور قابل نفاذ رہیں گے۔ اِلّا یہ کہ خود ناگالینڈ کی اسمبلی ان کے بارہ میں ایک تجویز کے ذریعہ ایسا طے کرے:

> No Act of Parliament in respect of (Naga customary laws) shall apply to State of Nagaland unless the Legislative Assembly of Nagaland by a resolution so decides (371-A).

ظاہر ہے کہ ان دونوں دفعات میں تضاد ہے۔ یہ تضاد اسی لیے ہے کہ ہمارے دستور سازوں نے بزعم خود جامع دستور بنانے کے لیے محض تخیل کے زور پر اس میں مختلف چیزیں اکٹھا کر دیں جو حقیقت کی دنیا میں کبھی اکھٹا ہونے والی نہ تھیں۔ غالباً اسی لیے دستور ساز اسمبلی کے ایک سینیر ممبر سر الادی کرشنا سوامی آئر نے دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ مستقبل کا قانون ساز ادارہ ہو سکتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ بنانے کی کوشش کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سرے سے اس کی کوشش ہی نہ کرے:

> The future Legislatures may attempt a uniform civil code or they may not. (Sir Alladi Krishnaswami Aayyar)

قانون کی محدودیت

قانون کوئی بالاتر چیز نہیں۔ دوسری تمام انسانی چیزوں کی طرح انسانی قانون بھی ایک محدود چیز ہے۔ ایک حد کے بعد انسانی سماج پر اس کی گرفت ختم ہو جاتی ہے۔

۱۹۷۵ میں الٰہ آباد ہائی کورٹ نے ایک فیصلہ دیا۔ اس میں اندرا گاندھی کے انتخاب کو نہ صرف رد کیا گیا تھا بلکہ اندرا گاندھی کو چھ سال تک انتخاب میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دے دیا

گیا تھا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا اعلان کر کے مزید اضافہ کے ساتھ دہلی کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۸۶ میں یوپی کی ایک عدالت نے اپنے فیصلہ کے تحت بابری مسجد کا بند دروازہ کھلوا دیا تاکہ ہندو آسانی کے ساتھ اس کے اندر پوجا کی رسم ادا کر سکیں۔ بظاہر اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خوش گوار تعلق قائم کرنا تھا۔ مگر اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد ایسا طوفان برپا ہوا کہ ہندو مسلم تعلقات آخری حد تک بگڑ گئے اور ہندستان سیاسی اور اقتصادی تباہی کے کنارے پہنچ گیا۔

شاہ بانو کیس میں ۱۹۸۵ میں سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ دیا۔ بظاہر اس کا مقصد عورتوں کے ساتھ انصاف کرنا تھا، مگر عملی نتیجہ یہ ہوا کہ راجیو گاندھی گورنمنٹ نے ایک قانون بنا کر سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو کالعدم کر دیا۔ دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس معاملہ کو بھرپور طور پر اپنے سیاسی فائدہ کے لیے استعمال کیا۔ یہاں تک کہ ہندستانی پارلیمنٹ میں اس کے ممبروں کی تعداد دو سے بڑھ کر ۱۱۹ تک پہنچ گئی اور کئی ریاستوں میں اس کی حکومت قائم ہو گئی۔

قانون کی محدودیت اس سے بھی ثابت ہے کہ ہندو کوڈ بل ۱۹۵۵ میں اگرچہ کسی ہندو کے لیے صرف ایک ہی نکاح کی اجازت رکھی گئی ہے۔ مگر ۱۹۶۱ کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق، ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی شرح ہندوؤں کے اندر مسلمانوں سے زیادہ ہے :

According to the Indian census report of 1961, the percentage of Hindus having more than one wife was more than that of the Muslims.

انگریزوں نے ہندستان میں اپنے دو سو سالہ اقتدار کے زمانہ میں صرف پانچ سو قانون بنائے۔ ہمارے لیڈروں کو ملک میں ۱۹۴۷ میں اقتدار ملا تو انھوں نے ۵۴ سال کی مدت میں پانچ ہزار سے زیادہ قانون بنا ڈالے۔ مگر اصلاحی قوانین کی کثرت صرف الٹا نتیجہ دینے والی (counter-productive) ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ملک میں جھگڑے بہت بڑھ گئے۔ کرپشن میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ انصاف حاصل کرنا انتہائی دشوار کام بن گیا۔ عورتوں کی حالت ہمیشہ سے زیادہ خراب ہو گئی۔ یہ حالات سماج سدھار کے لیے نئی تدبیر تلاش کرنے کا تقاضا کرتے ہیں نہ کہ قوانین میں مزید اضافے کا۔

تبدیلیٔ مذہب کا مسئلہ

سپریم کورٹ کی ڈویژن بنچ کے سامنے جو پٹیشن تھا اس کا براہ راست کوئی تعلق یونیفارم سول کوڈ سے نہیں تھا۔ یہ پٹیشن دراصل چار ہندو خواتین کی طرف سے عورتوں کی ایک تنظیم کلیانی (Kalyani) نے دائر کیا تھا۔ اس تنظیم کی پریسیڈنٹ شریمتی سرلا مدگل ہیں۔ ان چار ہندو عورتوں نے کہا تھا کہ ہمارے شوہروں نے اسلام قبول کر کے دوسرا نکاح کر لیا ہے، جب کہ انھوں نے ہمیں طلاق نہیں دی۔ ان کا قبول اسلام صرف اس لیے تھا کہ وہ اسلام کے قانون نکاح سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے دوسری بیوی حاصل کر سکیں۔ اس لیے عدالت ان کے دوسرے نکاح کو کالعدم قرار دے کر ہماری مدد کرے۔

عدالت نے مذکورہ پٹیشن کو منظور کرتے ہوئے چاروں ہندوؤں کے دوسرے نکاح کو کالعدم قرار دے دیا۔ اور ان کو ان کی پہلی بیوی کی طرف واپس لوٹا دیا۔ یہ فیصلہ دیتے ہوئے جسٹس کلدیپ سنگھ لکھتے ہیں :

جب تک ہم اصل منزل تک نہ پہنچیں، یعنی ہندستان کے تمام شہریوں کے لیے یونیفارم سول کوڈ، اس وقت تک یہاں ہندو شوہر کے لیے ایک کھلا محرک (inducement) باقی رہے گا جو کہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہو۔ جب کہ اس کی پہلی بیوی ابھی موجود ہو، ایسا ہندو اپنے مسلم ہونے کا اعلان کر کے دوسری شادی کرے گا۔ چونکہ ہندوؤں کے لیے یک زوجگی کا قانون ہے، اور مسلم قانون چار شادیوں تک کی اجازت دیتا ہے، کوئی کج رو ہندو شوہر ایسا کر سکتا ہے کہ وہ اسلام قبول کر لے تاکہ ہندو لا کے ضوابط سے بچ سکے اور دوسری شادی کے باوجود فوجداری قانون کی پکڑ میں نہ آئے۔ (صفحہ ۵)

اسی نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہوئے دی ہندستان ٹائمس ۲۱ جون ۱۹۹۵ میں لیٹرس کے کالم میں مسٹر چمن لال ورما نے لکھا تھا کہ یکساں سول کوڈ کی ضرورت اس لیے ہے کہ ان لوگوں کو مذہب کے غلط استعمال سے روکا جا سکے جو ایک قانون کی دفعات سے بچنے کے لیے دوسرے قانون کی دفعات کا سہارا لیتے ہیں :

A uniform civil code is required to prevent the misuse of religion to evade the provisions of one law to take advantage of those of another.

نیا قانون بنانا کسی بھی درجہ میں پچھلے قانون کے غلط استعمال کے خلاف چیک نہیں۔ قانون کے غلط استعمال کا موقع ہر حال میں باقی رہتا ہے۔ ٹیکس ماری کو روکنے کے لیے بے شمار قوانین اور ضوابط بنے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود ٹیکس ماری کا سلسلہ ہمالیائی سطح پر جاری ہے۔ پھر جب کسی بھی قانون میں اس کے غلط استعمال کو روکنا ممکن نہ ہوسکا تو سول کوڈ میں کیونکر ایسا ممکن ہوجائے گا۔

دوسری بات یہ کہ یونیفارم سول قانون کے نفاذ کے بغیر اگر ایسے ہندوؤں کے لیے کوئی قانونی چیک نہیں ہے تو سپریم کورٹ کے فاضل جج صاحبان کے لیے کیوں کر ایسا ممکن ہوا کہ وہ ایسے غلط ہندوؤں کے لیے سزا کا فیصلہ سنائیں اور ان کے دوسرے نکاح کو باطل (invalid) قرار دے دیں۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے جج صاحبان نے اپنا مقصد انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۴۹۴ کے ذریعہ حاصل کیا۔ گویا عدالت کی خود اپنی مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں بالفعل ایسے مانع قوانین موجود ہیں۔ اور کج رو ہندو کے لیے یہاں کوئی بے قید محرک پایا نہیں جاتا، حتی کہ موجودہ قوانین کے تحت بھی نہیں۔ پھر ایسے کج رو لوگوں کو کج روی سے روکنے کے لیے کسی نئے سول قانون کی کیا ضرورت :

The Court's own ruling shows that no such inducement is available to an "errant Hindu" even under existing law. You do not need a civil code to deter him.

دفعہ ۴۴ قابل حذف

اوپر میں نے جو تجزیہ کیا ہے اور جو دلائل جمع کیے ہیں، اس کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کی کوئی بھی قانونی یا اخلاقی یا سماجی معنویت نہیں۔ وہ کچھ دماغوں کا ایک فرضی تخیل تھا۔ اب اس کا واحد انجام یہ ہونا چاہیے کہ اس کو دستور سے حذف کردیا جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح جسم کی فاضل آنت (Appendix) کا آپریشن کرکے اسے نکال دیا جاتا ہے۔

اس قسم کا دستوری آپریشن کوئی نئی چیز نہیں۔ دستور ہند میں بار بار ایسے حذف و اضافے کیے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ابتدائی دستور میں انفرادی ملکیت کو مکمل طور پر محترم قرار دیا گیا تھا اور حکومت کو دستوری طور پر یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ کسی کی جائز ملکیت کو اس سے چھین سکے۔ مگر ۱۹۵۵ میں دستور میں چوتھا ترمیمی ایکٹ (The Constitution (Fourth Amendment) Act 1955)

منظور کیا گیا جس کی رو سے اسٹیٹ کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ کسی بھی شخص کی نجی ملکیت کو جبراً اپنے قبضہ میں لے لے۔ اس ایکٹ کی رو سے مالک جائداد کو اس حق سے بھی محروم کر دیا گیا کہ سرکاری معاوضہ اگر اس کو مارکٹ کی شرح سے کم معلوم ہو تو وہ عدالت میں اس کے خلاف استغاثہ دائر کر سکے۔

اسی طرح ابتدائی دستور میں سابق راجاؤں کو صَرف خاص (privy purses) کا حق دیا گیا تھا مگر ۱۹۷۱ میں دستور میں ۲۶ ویں ترمیم کی گئی جس کی رو سے اس دفعہ کا خاتمہ کر دیا گیا اور صَرف خاص کے سلسلہ میں ان کو دیے ہوئے تمام دستوری حقوق کو یکسر ساقط کر دیا گیا۔ وغیرہ۔

ان نظائر کی روشنی میں یہ بات کسی بھی درجہ میں انوکھی نہیں ہے کہ ایک اور ترمیم کے ذریعہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کو کامل طور پر حذف کر دیا جائے۔ اس کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوگا۔ البتہ ہمارا دستور ایک ایسے بوجھ سے ہلکا ہو جائے گا جو غیر ضروری طور پر اس کے اوپر لاد دیا گیا تھا۔

یونی کلچرنیشن یا ملٹی کلچرنیشن

ہندستان میں پچھلے سو سال سے دو مختلف سیاسی گروپ موجود رہے ہیں اور آج بھی وہ الگ الگ ناموں کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک وہ جو سیکولر آئیڈیالوجی پر ملک کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور دوسرا وہ جو ہندو آئیڈیالوجی پر ہندستانی سماج کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہندستان میں تمام لوگوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنایا جانا چاہیے۔

لیکن اگر غیر جانبدارانہ انداز سے دیکھا جائے تو یونیفارم سول کوڈ دونوں ہی کے نظریات کے خلاف ہے۔ اگر وہ اپنے نظریہ میں مخلص ہوں تو ہرگز انھیں اس قسم کے تصور کی حمایت نہیں کرنا چاہیے۔

سیکولرزم کا مطلب ہے ـــــــ مذہب کے معاملہ میں اسٹیٹ کا عدم مداخلت (non-interference) کی پالیسی اختیار کرنا۔ لوگوں کو اپنے عقیدہ و مذہب کی آزادی دیتے ہوئے صرف مشترک دنیوی امور کا انتظام و انصرام کرنا۔ یہی سیکولرزم کا عالمی سطح پر متفقہ مفہوم ہے اور اسی مفہوم کے مطابق دستور ہند کی تشکیل کی گئی ہے۔

کچھ لوگ سیکولرزم کی تشریح اس طرح کرتے ہیں گویا کہ وہ خود ایک مذہب ہے اور تمام مروجہ مذاہب کو ختم کر کے نجی دائرہ سے لے کر اجتماعی دائرہ تک زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دائرہ میں لینا چاہتا ہے۔

مگر یہ انتہا پسندی ہے۔ اس قسم کے انتہا پسند لوگ ہر مذہب اور ہر نظام میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ خود اسلام میں ایسے انتہا پسند لوگ موجود ہیں جو اسلام کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس میں اسلام سیاست اور جنگ کا مذہب بن جاتا ہے۔ مگر یہ غلو اور تشدد ہے، وہ اسلام کی صحیح نمایندگی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیکولرزم اور یونیفارم سول کوڈ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہندستان کا سیکولر گروپ اگر واقعۃً سیکولر گروپ ہے تو اس کو یونیفارم سول کوڈ کی بات نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ انفرادی دائرہ میں مذہبی آزادی سیکولرزم کا بنیادی اصول ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو ہندو آئیڈیالوجی کی بنیاد پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ اس گروہ کو جاننا چاہیے کہ اگر وہ ہندو آئیڈیالوجی میں عقیدہ رکھتا ہے تو یہ خود اس کے اپنے عقیدہ کے خلاف ہوگا کہ وہ ہر طبقہ اور فرقہ کو ایک ہی سول کوڈ کے تحت لانے کی کوشش کرے۔

ہندو آئیڈیالوجی کا بنیادی اصول سرو دھرم سمبھاو ہے۔ یعنی سب دھرم سچے ہیں۔ ہندوازم کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ کثرت میں وحدت (unity in diversity) کو مانتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت کے ظاہری فارم مختلف ہوتے ہیں مگر اندرونی حقیقت ایک ہوتی ہے۔ گویا ہندوازم کا عقیدہ ہے —— انیکتا میں ایکتا کو دیکھنا۔

سول کوڈ یا کسی بھی کوڈ کا تعلق ظاہری فارم سے ہے نہ کہ اندرونی اسپرٹ سے۔ ایسی حالت میں یہ ہندو نقطۂ نظر کے خلاف ہوگا کہ مختلف گروپوں کے پرسنل لا کو ختم کر کے سب کے لیے صرف ایک کوڈ جاری کرنے کی کوشش کی جائے۔

دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک (مثلاً برطانیہ، جرمنی، فرانس وغیرہ) میں ملٹی کلچرنیشن کا اصول رائج ہے۔ سنگاپور جیسے چھوٹے ملک سے لے کر امریکہ جیسے بڑے ملک تک ہر جگہ اسی اصول کو اختیار کر کے ترقی ہو رہی ہے۔ سوویت یونین غالباً واحد ملک ہے جہاں یونی کلچرنیشن بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لیے ہر قسم کی ریاستی طاقت استعمال کی گئی۔ مگر یونی کلچرنیشن تو نہیں بنی، البتہ خود سوویت یونین ٹوٹ کر ختم ہو گیا۔ تاریخ عالم کے یہ تجربات ہماری آنکھ کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں یکسانیت کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ قانون سے۔ اگر کسی سماج میں تاریخی عمل کے ذریعہ یکساں کلچر آجائے تو وہاں یکساں کوڈ بھی بن جائے گا۔ اس سے پہلے ایسا ہونا ممکن نہیں۔

اضافۂ آبادی کا ہوّا

متعدد سینیر شہریوں نے یہ بات کہی ہے کہ شادی بیاہ کا معاملہ انتہائی نجی معاملہ ہے۔ اگر کوئی کمیونٹی چاہتی ہے کہ اس نجی معاملہ میں وہ اپنے روایتی طریقہ پر قائم رہے تو اس میں دوسری کمیونٹی والوں کو اعتراض کرنے کی کیا ضرورت۔ اس واضح نامعقولیت کے باوجود کچھ انتہا پسند پولیٹکل عناصر کیوں یونیفارم سول کوڈ لانے کے لیے اتنا زیادہ شور وغل کر رہے ہیں۔ حتی کہ انھوں نے اعلان کر دیا ہے کہ آنے والے لوک سبھا الکشن میں ان کا اصل انتخابی اشو (main poll theme) یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ ہوگا (دی ہندستان ٹائمس ۱۷ جولائی ۱۹۹۵) جب کہ یقینی طور پر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں یونیفارم سول کوڈ کی بنیاد پر قانون بنانے کا عملاً کوئی امکان نہیں۔ اس جوش وخروش کا سبب خود یونیفارم سول کوڈ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نام پر سیاسی فائدہ حاصل کرنے کا معاملہ ہے۔ یہ عناصر انتہائی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت یہ غلط پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اگلی صدی کے نصف اول میں یہ واقعہ ہونے والا ہے کہ مسلمان یہاں اکثریت میں ہو جائیں اور ہندو خود اپنے ملک میں اقلیت بن کر رہ جائیں۔

اس بے بنیاد پروپگنڈے کے لیے انھوں نے ایک پرفریب نظریہ وضع کیا ہے۔ وہ اکثریتی فرقہ کے عوام سے کہتے ہیں کہ دیکھو، آزادی کے بعد بننے والی گورنمنٹ نے ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ کے ذریعہ ہندوؤں کو تو قانونی طور پر پابند کر دیا کہ وہ صرف ایک بیوی رکھ سکتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا جو پرسنل لا ایکٹ (۱۸۶۰) ہے، اس کے تحت ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ چار بیویاں رکھے۔ ہندو کے اوپر پابندی لگی ہوئی ہے، مگر مسلمان کے اوپر کوئی پابندی نہیں۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو کے مقابلہ میں مسلمان چار گنا زیادہ بچے پیدا کر سکتا ہے۔ اس ملک میں ہندوؤں کی آبادی اگر ۱-۲-۳-۴-۵ کی رفتار سے بڑھے گی تو مسلمانوں کی تعداد ۱-۴-۸-۱۶-۳۲ کی رفتار سے بڑھتی چلی جائے گی۔ اپنے سیاسی حریف کی اس طرح بھیانک تصویر دکھا کر یہ لوگ ہندوؤں میں اپنا ووٹ بینک بنا رہے ہیں۔ وہ ہندو عوام سے کہہ رہے ہیں کہ اس ہندو ورودھی سرکار کے خلاف ووٹ دے کر اس کو باہر پھینک دو:

Throw out this anit-Hindu government.

یہ پروپگنڈا بلاشبہ آخری حد تک بے بنیاد ہے۔ مسلمان عام طور پر ایک ہی شادی کرتے ہیں۔ میری

عمر ۳۷ سال ہو چکی ہے۔ مگر اس پوری مدت میں میرے علم میں کوئی ایک بھی ہندستانی مسلمان نہیں آیا جس نے چار شادیاں کر رکھی ہوں۔ حتی کہ ایسا کرنا ممکن بھی نہیں۔ کیوں کہ تمام مسلمان چار شادیاں اس وقت کر سکتے ہیں جب کہ ان کے یہاں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد چار گنا زیادہ ہو۔ یا ان کے پاس کوئی ایسا کارخانہ ہو جہاں وہ زیادہ عورتیں پیدا کر سکیں۔ مگر موجودہ مسلم سماج میں نہ تو عورتیں زیادہ ہیں اور نہ مسلمانوں کے پاس کوئی عورت ساز فیکٹری موجود ہے۔ ایسی حالت میں ان کے لیے کیوں کر ممکن ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص چار چار بیویاں رکھے۔ مسٹر بلراج پوری کا ایک پیراگراف اس سلسلہ میں نقل کرنے کے قابل ہے:

"اس خدشہ کا پہلا مقدمہ کہ تعدد ازدواج کے حق میں قانونی دفعہ اس پر عمل تک بھی پہنچائے گی، اشماریاتی مطالعہ سے ثابت نہیں ہوتا۔ عورت کی حیثیت کے بارہ میں نیشنل کمیشن کی رپورٹ کے مطابق، تعدد ازدواج فی الحقیقت دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے اندر کم ہے۔ اس کا دوسرا مقدمہ کہ تعدد ازدواج مسلمانوں کی آبادی کو زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھائے گا، منطقی طور پر مغالطہ آمیز ہے۔ بچہ پیدا کرنے کے قابل عورتوں کی تعداد چونکہ ہمیشہ یکساں رہتی ہے، اگر کچھ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کریں تو بہت سے مردوں کو بیویاں ہی نہیں ملیں گی۔ کسی فرقہ میں غیر شادی شدہ مردوں کی کثیر تعداد کسی بھی طرح اس فرقہ کی تولیدی صلاحیت میں اضافہ نہیں کرتی۔ واضح طور پر، چار آدمی چار بیویوں کے ساتھ زیادہ بچے پیدا کریں گے، بمقابلہ اس کے کہ ایک ہی مرد کے ساتھ چار بیویاں ہوں۔ اس طرح تعدد ازدواج کا طریقہ آبادی میں اضافہ کی رفتار کو گھٹانے والا ہے نہ کہ اس کو بڑھانے والا (انڈین اکسپرس ۶ جولائی ۱۹۹۵)

تقریباً یقینی ہے کہ مذکورہ انتہا پسند سیاسی عناصر اگلے الکشن میں ہندو ووٹروں سے کہیں گے کہ دیکھو، دستور کی دفعہ اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کے باوجود مسلمان یکساں سول کوڈ بنانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ وہ ایسا قانون بنانے کے مخالف اس لیے ہیں کہ اس کے بعد انھیں چار شادیوں کی اجازت نہیں رہے گی اور اس طرح وہ اپنی آبادی بڑھانے اور ہندوؤں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے بارہ میں اپنے منصوبہ کی تکمیل نہ کر سکیں گے۔ اس لیے ہمیں ووٹ دے کر ہم کو اقتدار تک پہنچاؤ تاکہ ہم اس خطرہ کا دفیعہ کر سکیں۔ مگر اس پروپگنڈے کا بے بنیاد ہونا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ خدا کی دنیا میں وہ کامیاب نہ ہو۔ ملک کا سب سے بڑا اخبار ٹائمس آف انڈیا ہر روز اپنے پہلے صفحہ پر اس قانون فطرت کا اعلان کرتا ہے کہ سچائی غالب آتی ہے (Let Truth Prevail)

مساوات نہیں ایڈجسٹمنٹ

۱۹۵۴ میں ہندستانی پارلیمنٹ نے اسپیشل میرج ایکٹ منظور کیا تھا۔ اس کے مطابق، مرد اور عورت کسی مذہبی رسم کی ادائگی کے بغیر مخصوص کورٹ میں جاتے ہیں اور ایک مجسٹریٹ کے سامنے اقرار کر کے ایک دوسرے کے قانونی میاں اور بیوی بن جاتے ہیں۔ کامن سول کوڈ اگر سیکولر اصول پر بنایا جائے تو وہ موجودہ اسپیشل میرج ایکٹ ہی کی ایک توسیع ہوگی۔ میں نے دہلی میں تحقیق کی کہ یہاں کتنے لوگ ہیں جنھوں مذکورہ ایکٹ کے تحت اپنی شادی کی ہے۔ کافی تلاش و تحقیق کے بعد مجھے صرف دو آدمی ملے۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ یہ دونوں کسی مذہبی رسم کے بغیر سادہ طور پر کورٹ میں گئے اور وہاں اپنا نکاح رجسٹر کرالیا۔ مگر چند ہی سال کے بعد دونوں شادیاں ٹوٹ گئیں اور اب مرد و عورت دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ میں نے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس علحدگی کا سبب "ایگوازم" تھا۔ دونوں میں اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر تکرار ہو جاتی۔ یہ تکرار بڑھتے بڑھتے مستقل علحدگی تک پہنچ گئی۔

مساوات مرد و زن کا جدید نظریہ کاغذ پر بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر زندگی میں سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ ایڈجسٹمنٹ ہے نہ کہ مساوات۔ مساوات کا تصور حقوق طلبی کا مزاج بناتا ہے اور ایڈجسٹمنٹ کا تصور حقوق کی ادائگی کا۔ یہی وجہ ہے کہ مساواتی ذہن کے مرد و عورت اکثر لڑ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، اور ایڈجسٹمنٹ کا ذہن رکھنے والے کامیاب گھر کی تعمیر کرتے ہیں۔

میں نے جاپان کے بارہ میں ایک کتاب پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ جاپانی عورت اور مرد کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ میں کسی کے ماتحت ہوں (I am under someone) اپنے اس احساس کی بنا پر جاپانی انسان ہمیشہ فریق ثانی سے ایڈجسٹ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی عورت سب سے زیادہ بری بیوی ہے اور جاپانی عورت سب سے زیادہ اچھی بیوی۔ اس کا راز یہی ہے۔ امریکی عورت پر سب سے زیادہ جو خیال مسلط ہوتا ہے وہ برابری کا تصور ہے۔ اس کے برعکس جاپانی عورت برابری اور نابرابری کی بحث سے اوپر اٹھ کر صرف یہ احساس لیے ہوتی ہے کہ مجھے موافقت کے اصول پر زندگی گزارنا ہے۔ اسی لیے ازدواجی زندگی میں امریکی عورت ناکام رہتی ہے اور جاپانی عورت کامیاب ——— اچھا خاندان بنانے کے لیے ہمیں سب سے زیادہ ایڈجسٹمنٹ پر زور دینا ہے نہ کہ مغربی تصور کے مطابق مساوات پر۔

ہندو برادریوں کا رواج

خود ہندوؤں میں شادی بیاہ کا کوئی ایک مقرر طریقہ نہیں۔ ہندوؤں میں سیکڑوں کی تعداد میں مختلف گروہ ہیں، اور ہر گروہ اپنے اپنے خاندانی یا علاقائی رواج کے مطابق شادی کی رسوم ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کرکٹ کے مشہور کھلاڑی ساچن ٹنڈولکر (Sachin Tendulkar) نے ۲۵ مئی 1995 کو بمبئی میں مسز انجلی مہتا سے شادی کی تو اخباری رپورٹ کے مطابق، ان کے نکاح کی تقریب مہاراشٹر کے روایتی انداز (traditional Maharashtrian-style) میں ادا کی گئی

(پانیر ۲۶ مئی ۱۹۹۵)

آج بھی تقریباً تمام ہندو اپنی شادیاں اپنے مذہبی رواج کے مطابق کرتے ہیں، اگرچہ اسپشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ کی صورت میں ان کے لیے ایک عمومی قانون موجود ہے:

Almost all Hindus still solemnise their marriages through religious customs although there is a civil way out through the Special Marriages Act of 1954. (The Hindustan Times, May 22, 1995)

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں۔ یہ دراصل وہی ہے جو ہونا چاہیے۔ شادی بیاہ کا تعلق انتہائی نجی معاملات سے ہے۔ ایسے معاملات میں ہر فرقہ ہمیشہ اپنے خاندانی یا گروہی رسم و رواج کے مطابق ہی عمل کرتا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

اصل ضرورت: نیشنل کیرکٹر

انڈیا کو ایک متحد اور پرامن اور ترقی یافتہ ملک بنانے کے لیے اصل میں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ نیشنل کیرکٹر ہے۔ ملک میں جتنی بھی کمیاں ہیں، یا جو بگاڑ بھی یہاں نظر آتا ہے۔ ان سب کا اصل سبب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آزادی کے بعد ملک کے لوگوں میں نیشنل کیرکٹر پیدا نہ کیا جا سکا۔

نیشنل سوچ شخصی سوچ کی ضد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ذاتی مفاد کو اہمیت دینے کے بجائے قومی مفاد کو اہمیت دے۔ جہاں کہیں دونوں تقاضوں میں ٹکراؤ ہو تو وہ شخصی مفاد کو پس پشت ڈالدے اور قومی مفاد والے طریقہ کو اختیار کرلے۔

باہر کا کوئی ملک پیسہ دے کر آپ کو خریدنا چاہے تو اپنے ملک کی محبت آپ کو اس سے روک دے۔ ٹیکس نہ دینے میں آپ کو ذاتی فائدہ ہو رہا ہو تب بھی آپ ٹیکس دیں کیوں کہ اس سے قوم کو فائدہ

ہوگا۔ ملاوٹی چیزیں سپلائی کرنے میں آپ کا ذاتی نفع بڑھتا ہو مگر آپ ایسا نہ کریں، کیوں کہ ایسا کرنے سے ملک کی ترقی رک جاتی ہے۔ ذاتی شکایت کے باوجود آپ قومی املاک کو نقصان نہ پہنچائیں اور اقتصادی پہیہ کو روکنے کی کوشش نہ کریں، کیوں کہ اس میں ملک کی تباہی ہے۔ الکشن میں اگر آپ ہار جائیں تو دل سے اپنی ہار کو مان لیں۔ کیوں کہ ہار نہ ماننے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کا پورا سیاسی نظام بگڑ جاتا ہے۔ اگر آپ ذمہ داری کے عہدہ پر ہیں تو اپنے مالی فائدہ کے لیے سکینڈل اور اسکیم میں ملوث نہ ہوں، کیوں کہ ایسا کرنے سے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو ایک بار حکومت مل جائے تو یہ نہ چاہیں کہ میں ہی ہمیشہ حکومت کی گدی پر بیٹھا رہا ہوں۔ کیوں کہ اس قسم کی سیاسی خود غرضی ملک کے جمہوری ڈھانچہ کو تباہی اور بربادی کے آخری کنارے پہنچا دیتی ہے۔ اگر آپ لیڈر ہیں تو اپنے الکشنی مفاد کے لیے ایک گروہ کے اندر دوسرے گروہ کے خلاف نفرت اور خوف کے جذبات نہ پیدا کریں۔ کیوں کہ اس سے آپ کا ووٹ بنک تو بنے گا۔ لیکن ملک کا بینک دیوالیہ ہو کر رہ جائے گا۔ وغیرہ

اسی کا نام سچی دیش بھگتی ہے۔ اور یہی ملک کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے۔ مگر یہی چیز آج ہمارے ملک میں موجود نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے لوگ دیش بھگت کے بجائے خویش بھگت ہو گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے فائدہ کی خاطر ملک کے فائدہ کو بھول گیا ہے۔ اسی خویش بھگتی نے ملک کا وہ برا حال کر دیا ہے جس کی آج ہر آدمی شکایت کر رہا ہے۔

دیش بھگتی کامن سول کوڈ جیسی ظاہری کارروائیوں سے کبھی نہیں آئے گی۔ بلکہ لوگوں کی سوچ کو تعمیری رخ دینے سے آئے گی۔ اس کے لیے ہمیں تمام ذرائع کو استعمال کر کے لوگوں کو ایجوکیٹ کرنا ہوگا۔ ہمیں تعمیر شعور یا ذہنی بیداری کی ایک طویل اور ہمہ گیر مہم چلانی ہوگی۔ یہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی دوسری چیز اس کا بدل نہیں۔

تعلیم کی اہمیت

دستور ہند کے رہنما اصولوں کے تحت جو دفعات درج ہیں ان میں سے ایک اس کی دفعہ ۴۵ ہے۔ یہ دفعہ کہتی ہے کہ ریاست یہ کوشش کرے گی کہ دستور کے نفاذ کے بعد دس سال کی مدت میں وہ تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم فراہم کر دے، یہاں تک کہ وہ چودہ سال کی عمر تک پہنچ جائیں:

The state shall endeavour to provide, within a period of ten years from the commencement of this Constitution, for free and compulsory education for all children untill they complete the age of fourteen years.

غالباً بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ دفعہ دستور کے رہنما اصولوں کے تحت درج شدہ دفعات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی یہی دفعہ سب سے زیادہ غیر اہم بنی ہوئی ہے۔ سپریم کورٹ نے کبھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ حکومت سے باز پرس کرے کہ دس سال کی مقرر مدت گزرنے کے باوجود اس دفعہ پر عمل کیوں نہیں کیا گیا۔

دستور ہند کا نفاذ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ کو ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نومبر ۱۹۵۹ میں دس سال کی یہ مقرر مدت پوری ہو گئی۔ مگر ملک کے تمام نوجوانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا نشانہ کسی بھی درجہ میں حاصل نہ ہو سکا۔

تعلیم کی اہمیت قومی تعمیر کے لیے اتنی زیادہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں کامن سول کوڈ کا معاملہ صرف ایک نان اشو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا واحد لکاتی نشانہ صرف یہ ہونا چاہیے کہ ہم ملک کی آبادی کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنائیں۔ اس کے سوا جس چیز کو بھی نشانہ بنایا جائے گا وہ اصل قابل لحاظ چیز سے توجہ کو ہٹانے (shift of emphasis) کے ہم معنی ہوگا۔ اور اس طرح توجہ کو اہم سے ہٹا کر غیر اہم میں الجھا دینا ایک قومی جرم ہے نہ کہ قومی خدمت۔

تعلیم کا تعلق اصلاً سروس سے نہیں ہے۔ تعلیم کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ شعور کی تربیت کرتی ہے۔ وہ آدمی کو صحیح طرز پر سوچنے والا بنا دیتی ہے۔ سماج یا قوم میں جتنے بھی مثبت اور مفید واقعات ہوتے ہیں وہ سب انھیں لوگوں کی دین ہوتے ہیں جو صحیح طرز فکر کے حامل ہوں۔

صحیح طرز فکر آدمی کے اندر دور اندیشی پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو بتاتا ہے کہ وہ اختلافات سے کس طرح نپٹے۔ وہ آدمی کے اندر وہ بالغ نظری پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر سکے۔ اس سے آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کو جانتا ہے۔ وہ ظاہر سے گزر کر اندرونی حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے۔ صحیح طرز فکر سے صحیح عمل ظہور میں آتا ہے، اور صحیح عمل ہی کسی فرد یا گروہ کو کامیابی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

سماج میں یک جہتی اور اتحاد کی فضا بنانے کے لیے اصل ضرورت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کا

شادی بیاہ کا طریقہ ایک ہو۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگ صحیح طرز فکر کے حامل ہوں۔ صحیح طرز فکر کیا ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو گا۔

سوامی ویویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۳) کو ایک کرسچین بھائی نے اپنے مکان پر بلایا۔ کرسچین نے سوامی جی کو جانچنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے ملاقات کے کمرہ میں ایک میز پر نیچے اور اوپر بہت سی مذہبی کتابیں رکھ دیں۔ سب سے نیچے ہندوؤں کی مقدس کتاب رامائن رکھی۔ اس کے اوپر مختلف مذہبوں کی کتابیں، اور سب سے اوپر اپنی مذہبی کتاب بائبل۔ سوامی ویویکانند جب کمرہ میں داخل ہوئے تو کرسچین میزبان نے کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھیے، اس کے بارہ میں آپ کا تبصرہ کیا ہے۔ سوامی جی کتابوں کی مذکورہ ترتیب کو دیکھ کر مسکرائے، اور کہا: فاؤنڈیشن تو بہت اچھی ہے۔

سوامی جی اگر اس معاملہ کو وقار (پرسٹیج) کا اشو بناتے تو وہ بگڑ جاتے۔ وہ کہتے کہ کیا تم نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے یہاں بلایا تھا۔ اب دونوں میں تکرار شروع ہو جاتی۔ عین ممکن ہے کہ یہ تکرار بڑھ کر اس نوبت تک پہنچتی کہ امن قائم کرنے کے لیے پولیس کو بلانا پڑتا۔ لیکن سوامی جی نے اس کو وقار کا مسئلہ بنانے کے بجائے اس کو اعراض کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو معاملہ دونوں کو لڑائی تک پہنچاتا، وہ دونوں کے درمیان مسکراہٹ کے تبادلہ پر ختم ہو گیا۔

یہ قابل قدر واقعہ کیوں کر پیش آیا۔ کیا اس لیے کہ سوامی ویویکانند اور مذکورہ کرسچین کا شادی بیاہ کا طریقہ ایک تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ کیوں کہ ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا عیسائی۔ اور ہندوؤں اور عیسائیوں میں شادی بیاہ کا طریقہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سوامی ویویکانند ایک ایسے آدمی تھے جن کی اعلیٰ تعلیم نے ان کو حد درجہ باشعور بنا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح کسی واقعہ کو منفی رخ دینے کے بجائے اس کو مثبت رخ دیا جا سکتا ہے۔ وہ سوچنے کا آرٹ جانتے تھے۔ وہ زندگی کی سائنس سے واقفیت رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح اختلاف کے باوجود اتحاد کے ساتھ رہا جا سکتا ہے۔ اس کا راز سوامی جی کی شعوری بیداری تھا نہ کہ کسی قسم کا مشترک سول کوڈ۔

مسلمانوں سے خطاب

آخر میں مسلمانوں سے میں گزارش کروں گا کہ وہ سپریم کورٹ کے موجودہ فیصلہ (۱۹۹۵) کے معاملہ میں ماضی کی اس غلطی کو ہرگز نہ دہرائیں جو سپریم کورٹ کے سابق فیصلہ (۱۹۸۵) کے معاملہ میں ان سے سرزد ہوئی تھی۔ دس سال پہلے جب شاہ بانو کیس پر عدالت عالیہ کا فیصلہ سامنے آیا تو مسلمانوں نے سارے ملک میں احتجاج اور مظاہرہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کا براہ راست فائدہ ملک کے انتہا پسند ہندو عناصر کو پہنچا۔

اب دوبارہ یہ عناصر انتظار کر رہے ہیں کہ مسلمان مشتعل ہو کر سڑکوں پر آجائیں تاکہ وہ مسلم خطرہ کا ہوّا کھڑا کر کے ہندوؤں میں اپنا ووٹ بینک بنا سکیں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ اپنی موجودہ حالت میں مسلمانوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ اگر مسلمانوں نے دوبارہ مظاہراتی طریقے اختیار کیے تو یقینی طور پر وہ ان کے لیے خطرہ بن جائے گا۔

یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی جگہ ہے۔ یہاں ہر ایک اس انتظار میں رہتا ہے کہ وہ دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ فریق ثانی کو یہ موقع ہمیشہ اس وقت ملتا ہے جب کہ ناخوش گوار صورت حال پیش آنے پر آپ بھڑک اٹھیں اور عاجلانہ اقدام کر بیٹھیں۔ اسی لیے قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ —— تم صبر کرو، جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا، اور ان کے لیے جلدی نہ کرو (الاحقاف ۳۵) صبر کا طریقہ فریق ثانی سے یہ موقع چھین لیتا ہے کہ وہ آپ کی کمزوریوں کا استحصال کر سکے۔ جب کہ بے صبری کا طریقہ آپ سے ایسی غلطیاں کراتا ہے کہ آپ نہایت آسانی سے فریق ثانی کے سازشی منصوبوں کا شکار ہو جائیں۔

کسی فریق کے خلاف سازش اگرچہ دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ مگر عملاً سازش کا شکار ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ خود فریق کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو سمجھنے میں زیر سازش گروہ کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

معجزہ کیا ہے

معجزہ کے لفظی معنی ہیں عاجز کر دینے والا۔ پیغمبروں کو معجزات اسی لیے دیے گئے تاکہ لوگ ان کی صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ معجزہ کو مخاطب کے اپنے میدان کے اعتبار سے معجز ہونا چاہیے۔ کیوں کہ آدمی کو جب تک اپنے مخصوص میدان میں عجز کا تجربہ نہ ہو وہ صحیح طور پر اس کی اعجازی حیثیت کا احساس نہیں کر سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، جن کا زمانہ چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح ہے، انھوں نے مصر کے جادوگروں کے سامنے دعوتی تقریر کی۔ مگر وہ اس سے متاثر نہ ہو سکے۔ لیکن جب انھوں نے جادوگروں کے سانپوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑے سانپ کا کرشمہ دکھایا تو تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے نظریاتی دلائل کا وزن محسوس کرنے کے باوجود اپنے مخصوص میدان میں پھر بھی وہ اپنے آپ کو موسیٰ سے فائق سمجھ رہے تھے۔ مگر موسیٰ کا عصا جب ان کے سانپوں سے زیادہ بڑا سانپ بن کر ظاہر ہوا تو حضرت موسیٰ کی عظمت آخری طور پر ان کے اوپر منکشف ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ دل سے حضرت موسیٰ کا اعتراف کر لیں۔

اسی لیے پیغمبروں کو جو معجزہ دیا جاتا ہے وہ مخاطب کے اپنے میدان کے اعتبار سے دیا جاتا ہے۔ مصر کے جادوگروں کو یہ فخر تھا کہ وہ رسّیوں کو سانپ کی صورت دے سکتے ہیں۔ تو حضرت موسیٰ کے عصا کو زیادہ بڑا سانپ بنا کر انھیں دکھایا گیا۔ شام و فلسطین کے طبیب عام مریضوں کو اچھا کرتے تھے تو حضرت مسیح کو یہ خصوصیت دی گئی کہ ناقابل علاج امراض میں مبتلا لوگ صرف ان کے چھونے سے اچھے ہو جائیں۔ عرب کے لوگوں کو اپنے ادب پر فخر تھا تو پیغمبر اسلامؐ کو قرآن کی صورت میں ایسا برتر ادبی نمونہ دیا گیا جس کے آگے ان کے تمام ادبی شہ پارے ہیچ نظر آنے لگے اور کہنے والے کہہ پڑے کہ : اَبَعْدَ القرآن ۔

خدا کا داعی اپنی ذات میں اپنی صداقت کا ثبوت ہوتا ہے۔ مگر مخاطبین عام طور پر اس کا ادراک نہیں کر پاتے۔ اس وقت خدا یہ کرتا ہے کہ مخاطبین کی اپنی فوقیت کے میدان میں انھیں داعی کے مقابلہ میں زیر کر دیتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے تاکہ داعی حق کی صداقت اس کے مخاطبین کے اوپر ناقابل انکار درجہ میں واضح ہو جائے۔

قرآنی اصول

قرآن میں ازدواجی زندگی کے احکام کے ذیل میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی گزارو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو (و عاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً) النساء ۱۹

اس قرآنی تعلیم کا تعلق صرف میاں اور بیوی سے نہیں ہے۔ وہ تمام انسانی تعلقات کے لئے عام ہے۔ خدا کی اس دنیا میں کامیاب اجتماعی زندگی گزارنے کا واحد اہم اصول یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد شعوری طور پر اس کو یاد رکھیں کہ کسی کی کوئی روش اگر ان کی پسند کے خلاف ہے تو خود اسی کے اندر کوئی اور صفت ہوگی جو ان کی پسند کے مطابق اور مفید ہوگی۔ اس لئے ہر ایک کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ متعلق مرد یا عورت کی ناپسندیدہ صفت کو نظر انداز کرکے اس کی پسندیدہ صفت کی بنیاد پر اس کو اپنا لے۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی کامل نہیں۔ ہر ایک کے اندر کوئی نہ کوئی کمی پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جس مرد یا عورت کا ہم تجربہ کر رہے ہوتے ہیں، اس کی کمی ہمارے علم میں آجاتی ہے۔ اور جس مرد یا عورت کا ہمیں عملی تجربہ نہیں ہوا اس کی کمی ہمارے علم میں نہیں آتی۔ اس لئے ہم غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ باقی لوگ تو اچھے ہیں، صرف یہ شخص برا ہے۔ حالاں کہ ایک کو چھوڑ کر جب ہم دوسرے سے معاملہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا آدمی بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ پہلا آدمی۔

اس لئے یہ ذہن درست نہیں کہ اس کو چھوڑ کر فلاں کو پکڑو۔ اس کے بجائے صحیح بات یہ ہے کہ نباہ کا ذہن پیدا کیا جائے۔ کامل کی تلاش آدمی کو کہیں نہیں پہنچاتی۔ اور نباہ کی روش آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ زندگی گزارے، وہ ہر ایک کے ساتھ مل کر اپنے لئے کامیاب زندگی کی تعمیر کرسکے۔

کل کا مسئلہ

پاکستان میں اس وقت مسز بے نظیر بھٹو وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہیں۔ اور میاں محمد نواز شریف اپوزیشن کے لیڈر ہیں۔ دونوں رات دن ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۲۵ اپریل ۱۹۹۵) کے صفحہ اول پر ایک خبر کی سرخی یہ ہے کہ: کل سے ڈریں، کل بہت قریب ہے۔

اسلام آباد کی ڈیٹ لائن کے ساتھ خبر میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ اور قائد حزب اختلاف میاں محمد نواز شریف نے کہا ہے کہ میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ آنے والے کل سے ڈریں اور اپنے مستقبل کی فکر کریں۔ کیوں کہ اب کل کا دن بہت نزدیک ہے۔ ہم پاکستان کے مستقبل سے کھیلنے والوں کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اس سلسلہ میں ہمارا عزم آسمان سے بھی بلند ہے۔ ہم پاکستان کا مستقبل بچانے کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

اس خبر میں ایک سیاسی لیڈر دوسرے سیاسی لیڈر کو جس "کل" سے ڈرا رہا ہے وہ آخرت کا کل نہیں ہے، بلکہ اسی دنیا کا سیاسی کل ہے۔ اس انتباہ کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے خلاف کارروائیوں سے باز آجاؤ، ورنہ ہم اتنی اودھم مچائیں گے کہ تمہاری حکومت ہی گر جائے۔

اگر آخرت کے کل کا مسئلہ ہو تو ہر آدمی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھے گا۔ کوئی شخص جب دوسرے کو ڈرائے گا تو عین اسی وقت وہ خود بھی ڈر رہا ہوگا۔ مگر دنیا کے کل کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں جب ایک شخص دوسرے آدمی کو ڈراتا ہے تو اس کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ میں محفوظ سمت میں ہوں۔ آنے والا کل دوسرے کے لئے مسئلہ ہے۔ وہ میرے لئے کوئی مسئلہ بننے والا نہیں۔

سیاسی کل کا نظریہ لوگوں میں سرکشی کا جذبہ ابھارتا ہے، اور اخروی کل کا عقیدہ لوگوں میں تواضع پیدا کرتا ہے۔ سیاسی کل کے پیچھے دنیا پرستی ہے اور اخروی کل کے پیچھے دنیا سے بے رغبتی۔ سیاسی کل خود غرضی کی پیداوار ہے اور اخروی کل ربانیت کی پیداوار۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۱۰۱

۱ جناب محمد میاں عبد اللہ میاں صاحب (پٹن، گجرات) الرسالہ کے مضامین کا گجراتی ترجمہ کر کے لوگوں میں پھیلاتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے الرسالہ مارچ ۱۹۸۸ کا ایک مضمون "یہ انسان" کا گجراتی زبان میں ترجمہ کر کے اس کو ہینڈ بل کی صورت میں چھپوایا ہے اور اس کو لوگوں خاص طور پر غیر مسلموں تک پہنچا رہے ہیں۔ اس طرح کی کوشش مختلف لوگ اپنے اپنے انداز سے کر رہے ہیں۔

۲ سنٹر فار پروموشن آف آلٹرنیٹو انسٹی ٹیوشنس (نئی دہلی) کے تحت ۲۹ اپریل ۱۹۹۵ کو نوائڈا میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: ریلیجن اینڈ میڈیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر خطاب کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ میڈیا کی شکایت کرنے کے بجائے ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ میڈیا کو غلط استعمال کا موقع نہ دیں۔

۳ جاپان کے زیر انتظام سولہ ملکوں کے ۵۰ آدمی عالمی پیس مارچ کر رہے ہیں۔ وہ راس کماری سے اپنا پیدل مارچ شروع کر کے اگست ۱۹۹۵ میں ہیروشیما پہنچیں گے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۹۵ کو گاندھی درشن (نئی دہلی) میں ان کے استقبال کے لئے میٹنگ تھی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور "امن" کے موضوع پر خطاب کیا۔

۴ امریکہ کے نشریاتی ادارہ انڈپنڈنٹ براڈکاسٹنگ ایسوسی ایٹس (I.B.A.) کے نمائندہ مسٹر ہولک (Julian Crandall Hollick) ۲۶ مارچ ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اب ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بلا اعلان ایک نیا فیصلہ لیا ہے۔ وہ یہ کہ اختلافی مسائل پر وہ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہیں کریں گے بلکہ پر امن تدبیر کے ذریعہ اپنے اختلافات کو حل کریں گے۔

۵ واشنگٹن کی نشریاتی تنظیم (Quorum Communications) کے صدر بنجمین بی ناگلیانو (Benjamin B. Nagliano) ۲۷ مارچ ۱۹۹۵ کو اپنی ویڈیو ٹیم کے ساتھ مرکز میں آئے۔

انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ فنڈا منٹلزم کا مطلب اگر بنیادی تعلیمات کی طرف واپسی ہو تو وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ لیکن اگر اس کا مطلب انتہا پسندی اور جنگجوئی ہو تو یقینی طور پر وہ غیر اسلامی اور قابل ترک ہے۔

۶ مزورجینیا وان ڈائک (Virginia Van Dyke) امریکہ کی واشنگٹن یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہی ہیں۔ ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع ہے:

Religious leaders in politics — alternative sources of political mobilisation

اس سلسلہ میں وہ ۲۹ مارچ ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئیں اور مذکورہ موضوع پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ ہندستان کی تاریخ میں ایک نقطۂ انقلاب تھا۔ اب ہندو اور مسلمان دونوں میں نیا سیاسی شعور جاگا ہے۔ قدیم طرز کی جذباتی سیاست کا دور اب ملک میں ختم ہو رہا ہے۔ اس کی ایک علامت یہ ہے کہ بابری مسجد کے اشو پر مسلم لیڈر مسلمانوں کو موبیلائز کرنے میں ناکام ہیں۔ اسی طرح ہندو لیڈر دوسری مسجدوں کے اشو پر ہندوؤں کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔

۷ انگریزی پندرہ روزہ نیشن اینڈ دی ورلڈ کے نمائندہ مسٹر آصف عمر نے ۳۰ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جو لوگ ہمارے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو سرینڈر کرنے کے لئے کہتے ہیں، وہ ہمارے اوپر ایک جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔ ہم ہمیشہ ریلسٹک اپروچ اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں نہ کہ سرینڈر کرنے کی۔ اس لئے جس کو تنقید کرنا ہے وہ ہماری اصل بات پر تنقید کرے نہ کہ ایک جھوٹی بات کو ہماری طرف منسوب کرے اور پھر اس کی روشنی میں ہمارے خلاف بے بنیاد رائے زنی کرے۔

۸ بھارت وکاس پریشد کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے راجستھان راودے پور،

بھیل واڑہ) کا سفر کیا۔ وہاں ۳۱ مارچ - یکم اپریل ۱۹۹۵ کو مختلف خطاب کئے اور ملاقاتیں کیں۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کردی جائے گی۔

۹ سری ستیہ سائی سیوا سمیتی کی طرف سے نوائیڈا (دہلی) میں ایک سرو دھرم سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ منتظمین کی طرف سے ان کے لئے اسلام کے اصول (Tenets of Islam) کا موضوع مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر تقریباً آدھ گھنٹہ تک خطاب کیا۔

۱۰ مولانا جمیل صاحب نے مدراس سے اطلاع دی ہے کہ الرسالہ میں شائع شدہ مقالہ "اسلام میں عدل اجتماعی" تامل زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا گیا ہے۔ اس کو تمل دانشوروں اور حقوق انسانی کے لئے جدوجہد کرنے والے لوگوں تک پہنچایا جارہا ہے۔ الحمد للہ اس کے بہت اچھے اثرات سامنے آرہے ہیں۔

۱۱ ۹ اپریل ۱۹۹۵ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک میٹنگ ہوئی۔ یہ میٹنگ مسٹر مدھو مہتا کی صدارت میں ہندستانی اندولن کے زیر اہتمام ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ہندستان کے مستقبل کی تعمیر پر اپنے خیالات پیش کئے۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سسٹم میں تبدیلی کے بجائے انسان میں تبدیلی لانے پر محنت صرف کرنا چاہئے۔

۱۲ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ کے نمائندہ مہاراج کرشن بھارت نے ۹ اپریل ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق حج کی عبادت سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ حجر اسود کی کوئی مشابہت بت سے نہیں ہے۔ بت کی پرستش اسلام میں اس لئے منع ہے کہ اس میں نافع اور ضار کا تصور ہوتا ہے۔ جب کہ حجر اسود کو نہ نافع وضار مانا جاتا اور نہ کوئی حاجی اس کے آگے جھکتا۔ کعبہ میں حضرت ابراہیم کے زمانہ کی واحد چیز صرف حجر اسود ہے۔ اس لئے اس کو پیغمبر کی تاریخی یادگار سمجھ کر چومتے ہیں، اور کسی چیز کو چومنا اسلام میں ناجائز نہیں۔ چومنا اور پرستش کرنا دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۱۳ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)

کے کانفرنس ہال میں ۱۰ اپریل ۱۹۹۵ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے وہاں "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے موضوع پر خطاب کیا۔ یہ خطاب انشاء اللہ مقالہ کی صورت میں الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

۱۴ سمرپن چیریٹیبل ٹرسٹ کی طرف سے ۱۰ اپریل ۱۹۹۵ کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں کیمپ لگایا گیا۔ یہ لوگ معذور افراد کو دوبارہ قابل کار بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ان کی تقریب میں شرکت کی اور معذوروں اور ضرورتمندوں کی خدمت کی اہمیت پر خطاب کیا۔

۱۵ روزنامہ ہندستان (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر اشوک کنکر نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے لئے بہترین پالیسی یہ ہے کہ وہ ناخوشگوار باتوں پر اوائڈ کریں۔ یہی واحد طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے وہ اپنی پسماندگی کو دور کر سکتے ہیں اور دوسری قوموں کی طرح ترقی کی راہ میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔

۱۶ یو این آئی کے نمائندہ مسٹر موکیش کوشک نے "دور بھاشں چرچا" کے تحت ۱۴ اپریل ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اصل سوال لوگوں کی سوچ کو بدلنے کا ہے۔ جب تک لوگوں کی سوچ نہ بدلے، محض سسٹم یا قانون کے بدلنے سے سماجی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

۱۷ انجمن فلاح المسلمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے لکھنؤ کا سفر کیا۔ وہاں ۱۶ اپریل ۱۹۹۵ کو گنگا پرساد میموریل ہال میں جلسۂ عام کو خطاب کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۸ ۲۹ اپریل ۱۹۹۵ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر قرآن کا درس دیا۔ درس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے، اور اس امتحان میں آدمی صرف صبر کے ذریعہ پورا اتر سکتا ہے۔

۱۹ اٹلی کی ایک مذہبی تنظیم کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اٹلی کا سفر کیا اور وہاں کی ورلڈ کانگرس

(۲۱ - ۲۳ اپریل ۱۹۹۵) میں شرکت کی اور خطاب کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفر نامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۲۱ سنٹر فار پروموشن آف آلٹرنیٹو انسٹی ٹیوشنس (نئی دہلی) کے تحت ۲۹ اپریل ۱۹۹۵ کو نوائیڈا میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: ریلیجن اینڈ ماس میڈیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔

۲۲ ایک مسلم تنظیم کی دعوت پر مئی ۱۹۹۵ کے پہلے ہفتہ میں کلکتہ اور مرشد آباد (بنگال) کا سفر ہوا۔ اس سفر میں متعدد خطابات ہوئے نیز ملاقات اور گفتگو کے پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفر نامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۲۳ ہندی روزنامہ دینک ہمالیہ درپن کے دہلی کے نمائندہ مسٹر پردیپ ٹھاکر نے ۶ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے تسٹی کرن یا ووٹ بنک کی سیاست کا سبب مسلمانوں کا احساس عدم تحفظ ہے۔ اگر صحیح رہنمائی کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر سے عدم تحفظ کے احساس کو نکال دیا جائے تو مسلمانوں کے اکسپلائٹیشن کی یہ سیاست بھی اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

۲۴ آکاش درشن انٹرپرائز (دہلی) نے ۷ مئی ۱۹۹۵ کو دور درشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق حج سے تھا۔ حج کا تاریخی پس منظر، اس کی شرعی اہمیت، اس کے مختلف قواعد کو سادہ انداز میں بتایا گیا۔

۲۵ فرنچ نیوز ایجنسی کے نمائندہ مسٹر نارائن سوامی نے ۱۱ مئی ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ خاص سوال یہ تھا کہ آج کے اخباروں میں سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ چھپا ہے کہ حکومت دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کے تحت کامن سول کوڈ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کارروائی کرے۔ جواب دیا گیا کہ خالص دستوری اعتبار سے یہ درست فیصلہ ہو سکتا ہے مگر عملاً وہ ناممکن ہے۔ دستور کی بہت سی چیزیں (مثلاً ہندی کو پندرہ سال میں واحد قومی زبان بنانا) ساری کوشش کے باوجود عمل میں نہ آسکا۔ اسی طرح کامن سول کوڈ بھی موجودہ حالات میں قابل عمل نہیں۔ کیوں کہ ہندستانی سماج ۹۹ فیصد سے زیادہ روایتی سماج ہے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو

	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	50/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	70/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	40/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	70/-
اسلام اور عصر حاضر	50/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	–
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	95/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	100/-
کتاب زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	35/-
عقلیاتِ اسلام	50/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	8/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	10/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	20/-
حقیقت کی تلاش	12/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	12/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعددِ ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	12/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کرچکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہوپتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

God Arises	Rs. 85/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	10/-
Words of the Prophet	–
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	150/-
رسول اللہؐ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے	25/-
جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحت لقمان	25/-